نئی دنیا کو سلام

تصنیفات

یہ کس کا خون ہے؟	(ڈرامہ)
منزل	(کہانیاں)
پیکار	(ڈرامہ)
زودیا	(حالات زندگی)
پرواز	(نظمیں)
جمہور	(مثنوی)
نئی دنیا کو سلام	(تمثیلی نظم)

زیرِ طبع کتابیں

نوروز	(نظمیں)
ادب اور تہذیب	(مضامین)
اقبال کی شاعری کا سماجی پس منظر	(تنقید)
نیا ہندوستان	(رجنی پام دت کی کتاب کا ترجمہ)

نئی دُنیا کو سلام

اور

جمہور

سردار جعفری

کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی
کتاب خانہ عابد روڈ حیدر آباد دکن

طبع اوّل		مئی سنہ ۱۹۴۷ء

فیروز مستری نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ سے
چھپوا کر کتب پبلشرز لیمیٹڈ ۱۷۔ گن بو اسٹریٹ بمبئی ۱
سے شایع کیا

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

نظیری

۱

نئی دُنیا کو سلام

ایک تمثیلی نظم

پیش لفظ

"نئی دنیا کو سلام" میری سب سے طویل نظم ہے۔ اردو زبان میں اس طرح کی کوئی چیز اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اس لئے یہ نظم پیش کرتے ہوئے مجھے تھوڑی سی جھجک ہو رہی ہے۔ جھجک کی وجہ خود اعتمادی کی کمی نہیں بلکہ نظم کا نیا پن ہے۔ کیونکہ اس سماج میں ہر نئی چیز شک اور شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کا موضوع بھی نیا ہے اور ٹکنیک بھی نئی۔ زندگی کے متعلق میرا زاویۂ نگاہ بھی دوسرے شعراء سے مختلف ہے اس لئے میں نے اکثر اشاروں کی جگہ تفصیلات سے کام لیا ہے۔ اشاروں اور کنایوں کا وقت بھی کبھی آجائے گا۔

یہ منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے۔ اس کے کردار کردار نہیں علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں بلکہ صرف مبہم سا خاکہ ہے جس کو میں نے رنگ بھرنے کے لئے بنایا ہے۔ واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کئے ہیں۔ جاوید اور مریم (میاں بیوی) جدوجہد کی علامتیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہے۔ نامہ بر ہمارا روایتی کردار ہے جس کے فرائض اس نظم میں بدلے ہوئے نظر آئیں گے۔ سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں

ہوا ہے۔ ابھی اس کے نقش و نگار بن رہے ہیں۔ وہ نئی دنیا کی علامت ہے۔ اس کی حسین اور معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے۔

میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اسکا ماضی بڑا شاندار رہا ہے اور حال دلکش امکانات سے معمور ہے۔ حالانکہ آج ہندوستان خانہ جنگی کے کرب میں مبتلا ہے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں ہو رہی ہیں جن سے دورِ وحشت کی درندگی بھی شرما جائے گی۔ لیکن یہ بلا بھی ہیضے اور طاعون کی وباؤں کی طرح گذر جائے گی، کیونکہ اس کے خلاف بھی وہی قوتیں جد و جہد کر رہی ہیں جو میری نظم میں کارفرما ہیں۔

دنیا کی "تاریخ میں کوئی دَور ایسا نہیں آیا جس میں "انسان" کو شکست ہوئی ہو۔ افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہوگی۔ لیکن "انسان" ناقابل شکست ہے کیونکہ اس کی محنت، عمل اور جد و جہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ماحول کی بھی خالق ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ فتح مند اور کامران رہے گا۔ یہ عقیدہ جاندار عقیدہ نہیں ہے، میرا سب سے بڑا انسپریشن ہے میں اس کو ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ عظیم المرتبت سب سے زیادہ حسین "انسان" ہے۔

سردار جعفری

بمبئی۔ دسمبر ۱۹۴۶ء

کردار

جاوید
فرنگی

مریم
نامہ بر

زندگی
تاریخ
وقت
موت

حرفِ اوّل

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مارِ سیاہ
سیاہ پھن ہیں سیہ پھول مسکرائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمین
سیہ عقاب، سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ سینوں کو تانے ہوئے سیاہ پہاڑ
سیاہ لوہے کی دیوار سی بنائے ہوئے
سیاہ وادیٔ صحرا، سیاہ دریا ہیں
سیاہ دشت ہے، سیہ کھیت لہلہائے ہوئے

سیاہ فیکٹری کی سیاہ چمنی پر
سیہ دھوئیں کے سیہ ابر تھرتھرائے ہوئے
سیہ چراغ سیہ روشنی سیاہ لویں
سیاہ گھر میں سیہ جال سا بچھائے ہوئے
سیاہ کیڑوں کے مانند رینگتی مخلوق
سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے
سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے
سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں
سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے
سیہ فضا میں سیہ تیر سنسناتے ہیں
سیاہ تیر سیہ زہر میں بجھائے ہوئے
سیاہ دار سیہ پھانسیاں سیہ پھندے
سیاہ ہاتھ سیہ گردنیں دبائے ہوئے
سیہ نشان بدن پر سیاہ کوڑوں کے
سیاہ زخم سیہ درد کو جگاتے ہوئے

سیاہ جبر، سیہ عصمتیں، سیہ سنگینیں
سیاہ عدل، سیہ کلغیاں لگائے ہوئے
سیاہ رنگ کے ساحر سیہ لبادوں میں
سیہ حصار، سیہ تیوریاں چڑھائے ہوئے
ضمیرِ عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اُجالے سے منہ چھپائے ہوئے

کہاں ہے روشنیِ صبحِ انقلاب کہاں؟
ضمیرِ حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں؟

پہلی تصویر

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

میرؔ

پہلی تصویر

(اندھیرے سے دو شکلیں ابھرتی ہیں۔ جاوید دولھا بنا ہوا اور مریم دلھن۔)

جاوید

نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا
بھلا عشق سے حسن کب تک چھپے گا
تو شرمائی جاتی ہے میری نظر سے
حجاب اور گل کو نسیمِ سحر سے؟
تو کیا میری فطرت کی محرم نہیں ہے؟
تو کیا میرے بچپن کی مریم نہیں ہے؟

گذاریں جو راتیں تری آرزو میں
سمٹ آئی ہیں کاکلِ مشک بو میں
جو پلکیں حیا سے جھکی جا رہی ہیں
وہ کچھ اور دل میں چبھی جا رہی ہیں
ترے رخ پہ حسن و محبت کا ہالہ
یہی ہے مری زندگی کا اُجالا
یہ شفاف آنکھیں، یہ آنکھوں کے ڈورے
چھلک جائیں جیسے گلابی کٹورے
جو ہاتھوں کو رنگ حنا مل گیا ہے
ہتھیلی پہ گویا کنول کھِل گیا ہے
محبت کی راتوں کی قندیل تو ہے
جوانی کے خوابوں کی تکمیل تو ہے
تمناؤں کے باغ کی تازگی ہے
خوشی کی چمکتی ہوئی تیزی ہے
ہے اک آنچ سی تیری نیچی نظر میں
ترے حسن سے روشنی میرے گھر میں
تکلم سے نغموں کی دنیا جگا دے
تبسم سے پھولوں کو ہنسنا سکھا دے

(مریم زیرِ لب مسکراتی ہے)

تری مسکراہٹ میں کیا دلکشی ہے
یہ پھولوں پہ سوئی ہوئی چاندنی ہے
مگر روح کی پیاس کیونکر بجھے گی؟
سمندر سے کیا صرف شبنم ملے گی؟

محبت ہے، نغمہ ہے، مے ہے، سبو ہے
مرے واسطے جو بھی کچھ ہے وہ تو ہے
تری خامشی کہہ رہی ہے فسانہ
تجاہل ہے تیرا بڑا عارفانہ

ہمارے دلوں کی ہے حسرت پرانی
ہماری شرابِ محبت پرانی
وہ گذری ہوئی شام ہے یاد اب تک
وہ ہے میرے سینے میں آباد اب تک

دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
دھندلکے کی پرچھائیاں ناچتی تھیں
ہر اک سمت انگڑائیاں ناچتی تھیں

اُفق پر کرن خواب سا بُن رہی تھی
دوپٹے کو اپنے شفق چُن رہی تھی

تری روح و دل پر گھٹے بادل سے چھائے
کھڑی تھی مرے پاس گردن جھکائے
مگر آنکھیں اپنی برسا رہی تھی
ترے پیرہن سے مہک آرہی تھی
ترے سر سے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا
مرے خون میں ساز سا بج رہا تھا
اسی رات کی طرح پلکیں جھکی تھیں
دھڑکتا تھا دل اور نبضیں رکی تھیں
کیا پیار سورج نے جھک کر زمیں کو
سجایا ستاروں سے شب نے جبیں کو
پھسل کر سیہ زلف شانوں پر آئی
ترے رخ پر اک شمع سی جھلملائی
مجھے تو نے دیکھا نگاہیں اٹھا کر
کہا پھر اشاروں سے کچھ مسکرا کر
سمجھ کر نگاہوں کا پیغام ہم نے
محبت کا پہلا پیا جام ہم نے
اسی جام نے ہم کو سرشار رکھا
ہماری تمنا کو بیدار رکھا

جدائی میں بھی صبر کرنا سکھایا
ہمیں آگ پر سے گذرنا سکھایا
مُرادوں کی مانگی ہوئی رات ہے یہ
کہ بچھڑے ہوؤں کی ملاقات ہے یہ

(مریم جاوید کی طرف محبت بھری
نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر پلکیں جھکا
لیتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے دو
چمکتے ہوئے آنسو ٹپک پڑتے ہیں
اور تمپئی رخساروں پر چاندی کی دو لکیریں
سی کھنچ جاتی ہیں۔)

مریم

مری ساری دولت محبت کے آنسو

جاوید

محبت کے آنسو، مسرت کے آنسو
یہ آنسو ہیں ٹوٹے دلوں کے سہارے
یہ تقدیر آدم کے روشن ستارے
تری ساری ہستی تری چشم نم میں
مرے گھر کی برکت ہے تیرے قدم میں

ہر اک رنج و راحت کی ساتھی ہے عورت
جہنم کو جنت بناتی ہے عورت
جبیں پر تجلی کی انجم فشانی
نظر میں زلیخا کی ہنستی جوانی
وہ مطلوب بھی ہے طلب گار بھی ہے
وہ غم خوار بھی اور دلدار بھی ہے
وہ ہے ساز بھی نغمہ بھی نغمہ گر بھی
گلستاں بھی گل بھی نسیم سحر بھی

ریم

مجھے بھی تو ہے یاد وہ رات اب تک
ہیں مٹھی میں میری وہ لمحات اب تک
کلی کی طرح جو کھلے جا رہے تھے
جو گھل کر لہو میں ملے جا رہے تھے
تمنائیں لہراتی تھیں خواب بن کر
برستے تھے جگنو اندھیرے سے چھن کر
حجاب اٹھ گئے تھے زمان و مکاں کے
دریچے تھے وا لذتِ جاوداں کے
رگوں میں مری دوڑتے تھے شرارے
مرے گرد تھے رقص میں چاند تارے

وہ رات آئی تھی ایک طوفان بن کر
سمندر کے سینے کا ہیجان بن کر
محبت کی کیف آفریں رات تھی وہ
جوانی کی سب سے حسیں رات تھی وہ

جاوید

وہ رات آج تک حسن برسا رہی ہے
وہ رات آج کی رات لہرا رہی ہے

دوسری تصویر

باغ کے آغوش میں گل چاہیئے
زندگانی میں تسلسل چاہیئے

جعفری

دوسری تصویر

جاوید کا گیت

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے
اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے
ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے

اُبھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے
جبیں پہ قوسِ قزح کی کماں جھکائے ہوئے
خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے
مری جوان تمنا کے شوخ پھولوں سے
سیاہ زلف کو گوندھے ہوئے سجائے ہوئے
وہ دھندلے دھندلے ستاروں کے نرم جھرمٹ میں
کنارے سرخ دوپٹے کے جگمگائے ہوئے
دھڑکتے سینے پہ آنچل کی ریشمی شکنیں
گذشتہ شب کی حسیں چاندنی چھپائے ہوئے
سڈول اور سبک بازوؤں کی لرزش میں
شبابِ شعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے
کھڑی ہے خواب و فسانہ کی سرحدوں کے قریب
اندھیری رات کے دل میں چمن کھلائے ہوئے
وفا کے جوش سے چہرے پہ روشنی دل کی
حیا کے رنگ سے رخسار تمتمائے ہوئے
بھوؤں پہ کتنی ہی انکار کی حسیں شکنیں
لبوں پہ کتنے ہی اقرار مسکرائے ہوئے

(بستر سے کہنیوں کے بل اٹھتی

مریم

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
"پرے اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"
اُبھرتی ہوئی وقت کے ساحلوں سے
گذرتی ہے وہ کتنی ہی منزلوں سے
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے
کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے
تبسم نہیں صرف، تلوار بھی ہے
وہ نغمہ نہیں صرف جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حسن و جوانی
شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی
وہ شمع شبستاں ہے، نورِ سحر ہے
وہ ہر گام پر مرد کی ہمسفر ہے
مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے
وہ تخلیق کے دل کا سوزِ نہاں ہے

صدف کی چمک میں ہے موجِ گہر بھی
کلی میں نہاں گل بھی ہے اور ثمر بھی
نگاہوں میں ہے شوخیِ دلبرانہ
جبیں پر مگر عظمتِ مادرانہ
وہ عورت کی جسمانیت کی چمک ہے
یہ عورت کی روحانیت کی جھلک ہے
جوانی کو شاداب کرتی ہے عورت
محبت کو سیراب کرتی ہے عورت
ہے انسان کی کائنات اس کے دم سے
فروزاں ہے شمعِ حیات اس کے دم سے
جس آنچل کو بچے پہ وہ ڈالتی ہے
جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ
وہ آغوشِ تہذیب کا گاہوارہ
محبت کی راتوں کی شیرینیوں کو
جوانی کی پُرکیف رنگینیوں کو
نگاہوں کے رس کو لبوں کی شکر کو
مہکتے تبسم کے گلہائے تر کو

نیا رنگ اور روپ دیتی ہے عورت
نئی شکل میں ڈھال لیتی ہے عورت

جاوید

جو کونپل تھی کل اب ہے پھولوں کی ڈالی
تو ہے میرے بچے کی ماں بننے والی

مریم

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے
مری سانس میں دل دھڑکتا ہے جیسے
رگ و پے میں کوئی سمایا ہوا ہے
مری روح پر رنگ چھایا ہوا ہے
کوئی دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے
مرے خون میں کشتیاں کھے رہا ہے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ
رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
مرے ذہن میں چل رہی ہیں ہوائیں
امنڈتی ہوں جیسے سنہری گھٹائیں
بگڑتی ہیں، بنتی ہیں، شکلیں فضا میں
مہکتے ہیں لاکھوں شگوفے ہوا میں

یہ اک موجِ طوفاں ہے جو بڑھ رہی ہے
ندی دم بدم دم بدم چڑھ رہی ہے
نگاہوں پہ نشّہ سا چھانے لگا ہے
ہر اک چیز پر پیار آنے لگا ہے
زمیں، آسماں، چاند، سورج، ستارے
مجھے دور سے کر رہے ہیں اشارے
بہاریں مری راز داں ہو گئی ہیں
ہوائیں مری ہم زباں ہو گئی ہیں
نسیمِ سحر گدگداتی ہے مجھ کو
کلی دیکھ کر مسکراتی ہے مجھ کو
اک ارمان آغوش میں پل رہا ہے
تصور مرا گھٹنیوں چل رہا ہے
لہو ناچتا ہے، رگیں ٹوٹتی ہیں
مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

حبا دید

حیاتِ بشر ہے بڑی شاعرانہ
محبت ہے جس کی بقا کا بہانہ
وہ نغمہ جو بنتا ہے سرگوشیوں سے
جو ہوتا ہے پیدا ہم آغوشیوں سے

لرزتی ہیں پلکیں، سمٹتے ہیں ابرو
پھڑکتے ہیں پہلو، مچلتے ہیں بازو
تڑپتے ہیں دل اور دھڑکتے ہیں سینے
جوانی نکلتی ہے لے کر سفینے
چمکتے ہیں ماتھے، دمکتے ہیں چہرے
مہکتے ہیں پھولوں کے شاداب سہرے
نکھرتا ہے صندل، جھلکتی ہے افشاں
لچکتی ہیں شاخیں، چٹکتی ہیں کلیاں
ابھرتے ہیں جلوے، بکھرتے ہیں جلوے
بکھرتے ہیں جلوے، سنورتے ہیں جلوے
ڈھلکتے ہیں گیسو، سرکتے ہیں آنچل
امنڈتے ہیں بادل، برستے ہیں بادل
یونہی اڑ رہا ہے نشاں زندگی کا
ٹھٹکتا نہیں کارواں زندگی کا
تسلسل حقیقت، تسلسل فسانہ
تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ
تسلسل ہے دریائے جاں کی روانی
تسلسل سے انسان ہے جاودانی

۳۴

کرن سے کرن اس طرح پھوٹتی ہے
کہ جس طرح سے پھلجھڑی چھوٹتی ہے

تیسری تصویر

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

اقبال

تیسری تصویر

(مریم پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں سے اپنے ہونے والے بچے کے
لئے ایک چھوٹا سا کرتا سی رہی ہے۔ کپڑے کے ٹکڑے مختلف رنگوں کے ہیں)
پس منظر سے کورس کی آواز

زندگی کا ترانہ

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہوائیں مشکبار ہیں فضائیں زرنگار ہیں
اُفق کے کوہسار ہیں شفق کے آبشار ہیں
نجوم شاخ کہکشاں فلک کے برگ و بار ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے

اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ترانہ ہائے چنگ ہیں سرودِ موجِ گنگ میں
بتانِ آذری مچل رہے ہیں خشت و سنگ میں
سفینہ آفتاب کا رواں ہے نور و رنگ میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسیں ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہمالیہ کی چوٹیاں فلک سے ہم کنار ہیں
حقیر جن کے سامنے جہاں کے تاجدار ہیں
یہ ایشیا کی آبرو یہ ہند کا وقار ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

تڑپ رہی ہے موجِ بحرِ عشق ماہتاب میں
ہمیشہ کش مکش میں ہے ہمیشہ اضطراب میں
ہمیشہ سوز و ساز میں ہمیشہ پیچ و تاب میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

نسیمِ صبح نکہتوں کے کارواں لئے ہوئے
شمیمِ گل سرورِ قلب و کیفِ جاں لئے ہوئے
سرور و کیف میکدے کی سنّیاں لئے ہوئے
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

دمکتے عارضوں کا رنگ کاکلوں کی چھاؤں میں
مہکتے آنچلوں کا رقص ریشمی ہواؤں میں
لچکتے قامتوں کی تھرتھراہٹیں فضاؤں میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

لبوں میں شہد انکھڑیوں میں رس شراب ناب کا
ربابِ زندگی پہ پہلا زمزمہ شباب کا
سبق دلوں کے مکتبوں میں عشق کی کتاب کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

جواں لبوں کی مسکراہٹوں میں گل فشانیاں

عرقِ عرق جبیں کی تابشوں میں کہکشانیاں
شکستِ حسن میں بھی فتحِ حسن کی کہانیاں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

چمن میں گونجتا ہے نغمۂ بلبلِ حیات کا
شگفتہ اور رنگ ہو گیا گلِ حیات کا
طفولیت ہے معجزہ تسلسلِ حیات کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہزاروں قوتیں مچل رہی ہیں جوئبار میں
ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں
ازل سے بے قرار ہیں کسی کے انتظار میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہیں ذرہ ہائے آتشیں سرشت کائنات میں
رواں انھیں کا گرم خون ہے رگِ حیات میں

مگر یہ قوتیں ہیں آج آدمی کے ہات میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

شکستہ ہے ہر ایک حلقہ قسمتوں کے دام کا
فضائے نیلگوں پہ سکّہ ہے بشر کے نام کا
یہ مہر و ماہ و مشتری؟ سفر ہے ایک گام کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

یہ برق و باد و رعد سب اسیر ہیں غلام ہیں
عمل کے میکدے میں کامرانیوں کے جام ہیں
وہ نغمے پختہ ہو رہے ہیں اب تلک جو خام ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

سوار دوش کہکشاں پہ ہو رہا ہے آدمی
نوہمات کی سیاہی دھو رہا ہے آدمی
خوشی کی مے میں اپنے غم ڈبو رہا ہے آدمی

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

مگر غلام قوم کی گھٹی ہوئی ہے زندگی
مثالِ شمعِ مفلسی بجھی ہوئی ہے زندگی
سیاہیوں کے درمیاں گھری ہوئی ہے زندگی

اگرچہ یہ جہانِ آب و گِل بہت حسین ہے
مگر غموں سے چور چور شیشۂ زمین ہے

(شور نعرے بند وقیں چلنے کی آوازیں ۔)

مریم

ہر طرف شورِ محشر بپا ہے
شہر میں جانے کیا ہو رہا ہے؟

جاوید (داخل ہوتے ہوئے)

تو کہ رنگین خوابوں میں کھوئی ہوئی ہے
اتنی غافل ہے گویا کہ سوئی ہوئی ہے

دیکھ اس ننھی منی سی جاں کو
جو ترے دل کے نیچے ترے نرم اور گرم پہلو کے گہوارے میں
بے خبر سو رہی ہے
جس کے جسم اور جاں کی ترے خون سے
پرورش ہو رہی ہے۔
جب وہ دنیا میں آئے گا تو ماں کی محبت
تیرے شفاف سینے سے اک دودھ کی نہر بن کر بہے گی
تیرے شفاف سینے کی نوخیز کلیاں
جو محبت کی راتوں میں کھل اٹھتی تھیں پھول بن کر
نور سے جن کے دیوار و در جگمگا جاتے تھے
اور شرما کے چاند ابر میں منہ چھپا لیتا تھا
اب انھیں چھاتیوں میں تری ماں کلبلائے گی اور تو محبت
سے بچے کو آغوش میں بھینچ لے گی
اور وہ فرطِ مسرت سے ننھی سی باہیں اٹھا کر
ڈال دے گا ترے چاند سے اس گلے میں کہ جس سے مرے گرم
بوسے گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے ہیں
اور جب اپنے ہونٹوں سے، وہ پولے پولے پیئے گا ترا دودھ،
نو نو مہینے کی کاری مشقت کی ساری تھکن
تیری رگ رگ سے کھینچ آئے گی

اور تجھے
اپنی بھرپور اٹھتی جوانی کا احساس ہوگا
جب وہ سوتے میں دیکھے گا، پریوں کے خواب
اور آہستہ سے، زیرِلب مسکرائے گا، تو تجھ کو معلوم ہوگا، کہ ان ننھے
معصوم ہونٹوں میں، دنیا کے سارے خزانے سمٹ
آئے ہیں۔
پھر وہ جب گھٹنیوں چلنا سیکھے گا، اور ٹوٹے ٹوٹے ہوئے لفظ
تتلا کے بولے گا، تو تجھ کو محسوس ہوگا، کہ تخلیق
کا رقص و نغمہ، سمٹ کر تری گود میں آگیا ہے

یہ خوشی وہ ہے جس کے مقابل، زمانے کی جتنی بھی خوشیاں
ہیں سب ہیچ ہیں
لیکن اس ملک میں جس کو ہندوستان کہتے ہیں
یہ خوشی بھی میسر نہیں ہے
ہر طرف کال کی آندھیاں چل رہی ہیں
خاک سے اُڑ رہے ہیں وباؤں کے کالے بگولے
موت کی ڈائنیں چیختی اور چنگھاڑتی پھر رہی ہیں
مائیں بچوں کو آنچل کے نیچے چھپائے ہوئے خوف سے کانپتی ہیں
ان کے کانوں میں ہر سمت سے یہ بھیانک صدائیں چلی آرہی ہیں

"سوکھ جائیں گے ماؤں کے شاداب سینے
اور بچوں کے ہونٹوں سے اُڑ جائے گی مسکراہٹ
ریگزاروں میں تبدیل ہو جائے گا یہ چمن
دودھ کی جس میں نہریں رواں ہیں "
اور پھر تو بھی مریم
میری مریم
میرے بچے کی ماں
تو بھی بنگال کی سیکڑوں عورتوں کی طرح اپنے روتے ہوئے
لال کو، دل کے ٹکڑے کو، سنسان راہوں کی جلتی
ہوئی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے گی ان قحبہ خانوں
میں، جن میں کہ روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے
کی خاطر جواں عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح
بک رہی ہیں۔
تیرے مظلوم بچے کی چیخیں
دور تک تیری پرچھائیوں کا تعاقب کریں گی
خواب میں روح کو تیری آکر جھنجھوڑیں گی لیکن
تو کسی قحبہ خانے میں روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے کی خاطر
اپنے دل، جسم اور روح کو بیچ دے گی
اپنے ہاتھوں سے خود اپنی ہی مامتا کا گلا گھونٹ دے گی۔

دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں ———
بھوک اور موت کے سائے میں
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

روٹیاں شاخِ طوبیٰ میں پھلتی نہیں ہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں ہیں
وحی و الہام بن کر اُترتی نہیں ہیں
روٹیاں، گندمی روٹیاں، سرخ سونے کے ترشے ہوئے
گول ٹکڑے
چاند کی طرح گول اور سورج کے مانند گرم
آہ یہ روٹیاں آسمانوں میں پکتی نہیں ہیں
یہ ہیں انساں کے ہاتھوں کی تخلیق
اس کی صدیوں کی محنت کا پھل
چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ایک دہقان
اپنے لکڑی کے ہل اور لوہے کے پھل سے
کھیت کو جوتتا ہے
اپنی آنکھوں میں صدیوں کی بیچارگی، مفلسی اور تھکن لے کے آتا ہے

اور خاک سے پھوٹتی کونپلوں کو بڑے پیار
سے دیکھتا ہے
اپنے روتے بلکتے ہوئے شیر خواروں کا دکھ بھول کر
اپنے ہاتھوں سے، بڑھتے ہوئے سبز پودوں کو، اس شوق
سے سینچتا ہے
جیسے وہ اس کی گودوں کے پالے ہوئے لال ہیں
اور پھر نرم شاخوں میں گیہوں کے خوشے
موتیوں کی طرح پھلتے ہیں
اور دہقان کی روح بیتاب ہو کر اُنھیں چومتی ہے
آسماں ناچتا ہے زمیں گھومتی ہے
کھیت کٹتے ہیں، کھلیان لگتے ہیں، پھر چکیاں گاتی
ہیں، لڑکیاں گاتی ہیں
کتنے ہی ہاتھوں میں لاکھ اور کانچ کی چوڑیاں گنگناتی ہیں
اور آگ کی آنچ میں تمتمانے ہیں رخسار
اس طرح گیہوں کے چاند سورج
گاؤں میں، شہر میں، ہر جگہ، جگمگاتے ہوئے چولھوں پر
ناچتے ہیں
روٹیاں، گندمی روٹیاں، سرخ سونے کے ترشے ہوئے
گول ٹکڑے

چاند کی طرح گول اور سورج کے مانند گرم
روٹیاں شاخِ طوبیٰ میں پھلتی نہیں ہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں ہیں
وحی و الہام بن کر اُترتی نہیں ہیں
یہ ہیں انساں کے ہاتھوں کی تخلیق
لیکن اس وقت انساں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی روٹیوں کے لئے
عصمتیں بک رہی ہیں
عزتیں بک رہی ہیں
گولیاں چل رہی ہیں
خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں
چکیاں چپ ہیں، خاموش ہیں، گاؤں کی لڑکیاں، چوڑیاں
گنگناتی نہیں ہیں
کھیت کٹتے ہیں اب بھی
اور کھلیان لگتے ہیں اب بھی
لیکن اب گاؤں ویران ہیں
چور بازار کی رونقیں بڑھ رہی ہیں
لڑکیاں چکیاں چھوڑ کر در بدر ٹھوکریں کھا رہی ہیں
اور دہقاں کی آنکھیں جو پتھرا رہی ہیں
اپنی صدیوں کی بیچارگی، مفلسی اور تھکن کو لئے

اپنے بچوں کو فاقوں سے مرتے ہوئے دیکھتی ہیں

دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں ——

بھوک اور موت کے سائے ہیں ——

کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

دیکھ اپنے برہنہ بدن کو

نوجوانی کے دلکش چمن کو

جس پر افلاس رنگِ خزاں کی طرح چھا گیا ہے

تیرا پیوندا ور چیتھڑوں کا یہ ملبوس سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح ہنس رہا ہے

اور تو مجھ کو ایسی نظر آ رہی ہے

جیسے پت جھڑ کے موسم میں پھولوں کی روتی ہوئی ڈالیاں ہوں۔

ہم ہیں اس ملک کے رہنے والے

جس کے ڈھاکے کی ململ پہ دھوکا ہو آبِ رواں کا

ہم وہ تن زیب بُنتے ہیں جس سے جواں جسم کی جوت بادل سے چھنتی ہوئی چاندنی کی طرح پھوٹتی ہے

جامدانی کی نازک سبک چولیاں

جن کے ہر تار میں مسکراتی ہیں بیلے کی کلیاں
اور اس سے زیادہ حسین کامدانی کے آنچل
چھاؤں میں جن کی سوتے ہیں تارے
اور وہ کشمیر کے ریشمی پیراہن
جن پہ قربان سنجاب و دیبا و اطلس
گرچہ یہ سب ہیں ملبوس ہندوستاں کے مگر ہم غلاموں کو ان کے
پہننے کا حق ہی نہیں ہے
ان کا اب ذکر بے کار ہے
دستکاروں کے زخمی انگوٹھے
ڈیڑھ سو سال سے ظلم کی داستاں کہہ رہے ہیں
ہم کو تو کارخانے کا لٹھا
چھینٹ کا ایک ٹکڑا
موٹے کھدر کا کرتا
اور گاڑھے کا بھدا کفن بھی میسر نہیں ہے
سر کھلی عصمتیں پھر رہی ہیں
بے کفن میتیں سڑ رہی ہیں
ہاں مگر چور بازار میں ، دیش بھگتی ، کے بوروں میں لپٹے ہوئے تھان
کے تھان رکھے ہوئے ہیں
دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں ————

بھوک اور موت کے سائے میں ــــــــــ
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

اپنے آباؤ اجداد کی اس زمیں پہ
اس بہشت بریں پر
ہم کو اب چین سے سانس لینے کا حق بھی نہیں ہے
دیکھتا ہوں میں جب اپنے گھر کو
اس کے دیوار و در کو
اس کی گرتی ہوئی ٹوٹی چھت کو تو محسوس ہوتا ہے یہ گھر نہیں جیل کی کوٹھری ہے
جس کی دیواروں سے تیرگی رس رہی ہے
یہ مکان کیا ہے بیماریوں اور وباؤں کا گہوارہ ہے
اس کے کونوں میں ہر طرح کی لعنتیں پل رہی ہیں
لیکن ایسے بھی انسان ہیں جن کو یہ کوٹھری بھی میسر نہیں ہے
ان کے سر پہ ہے چھت آسمان کی
اور چاروں طرف دھوپ گرد اور بارش ــــــــــ
غصے میں پیچ اور تاب کھاتے عناصر کی دیواریں ہیں

کتنی ہی عورتیں کتیوں اور بلیوں کی طرح اپنے بچے گلی
کوچوں میں جن رہی ہیں
ہم سے بہتر ہیں کیڑے مکوڑے
ان کے سر پر ہری گھاس کے سائبان ہیں
سبز پیڑوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں طائروں کے حسیں
آشیاں ہیں
سانپ بچھو بھی آرام سے رہتے ہیں اپنے اپنے بلوں میں
بھیڑیئے اور گیدڑ پہاڑوں کے غاروں میں اور جنگلوں کے
درختوں کے نیچے
دھوپ گرد اور بارش سے بچ کر بڑے چین سے سوتے ہیں
لیکن انسان، معمار و خلاقِ انسان
آج انگریز کے راج میں گھر سے بے گھر ہوا ہے
دستِ فطرت نے کہسار و دشت و بیاباں بنائے
آدمی نے گلستاں بنائے
اپنے بازو کی قوت سے قصر اور ایواں بنائے
اس نے پتھر میں محراب کا لوچ مینار کا حسن پیدا کیا
اور دیواروں کو استقامت عطا کی
جن کے دروازے آغوشِ محبوب کی طرح وا ہو رہے ہیں
لیکن انگریز کے راج میں

ظالم انگریز کے راج میں
آج معمار و خلاق انسان
گھر سے بے گھر ہوا ہے

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

تیری ہم عمر کتنی ہی مائیں
کوئلے اور لوہے کی کانوں میں اپنی شکستہ جوانی سے لپٹی ہوئی
رو رہی ہیں
ان کے بچوں کی معصومیت چھن چکی ہے
دیو ہیکل مشینوں نے لوہے کے دانتوں سے ان کی خوشی کو چبا
ڈالا ہے
دیو ہیکل مشینوں کو انسان نے سیکڑوں سال کی کش مکش اور مشقت
سے پیدا کیا ہے
تب کہیں جا کے لوہے کے یہ ہاتھ حاصل کئے ہیں
جن کی نبضوں میں بجلی کی لہروں کا خوں دوڑتا ہے
وہ اگر چاہیں کوہ گراں کو اٹھا لیں
کہکشاں کو زمیں پر بچھا لیں
کام کی لمبی گھڑیوں کو لمحوں میں تبدیل کر کے فراغت کی مدت

بڑھا دیں
مفلسی اور بیکاری سب کچھ مٹا دیں
خاک کو سونا پتھر کو پارس بنا دیں
لیکن ان آہنی ہاتھوں میں آج "سرمائے" نے چاندی کی
ہتھکڑی ڈال دی ہے
کارخانوں کے دل سے دھواں اُٹھ رہا ہے
اور مشینوں کے اعصاب جکڑے ہوئے ہیں
سخت لوہے کی نبضوں میں بجلی کا خوں جم گیا ہے
اور بیمار "سرمایہ داری"
خون پی پی کے قے کر رہی ہے

مریم
آہ ظالم حکومت

جاوید
آج انسان کی ان کنیزوں —— مشینوں —— کی طاقت پہ
"سرمایہ داری"
کتنی اترا رہی ہے
وہ مشینوں سے انسان کے دل کو برما رہی ہے
اور فراغت نہیں بلکہ بیکاری پھیلا رہی ہے
کالے کالے دھوئیں کے گھنے بادلوں سے وہ دولت کے موتی

نہیں مفلسی کے جراثیم برسا رہی ہے

دیکھ، کس طرح مزدور جو جسم پر پیرہن کی جگہ اپنی ہی کھال پہنے ہوئے پھر رہے ہیں

صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹتے وقت اپنے اندھیرے بلوں سے نکلتے ہیں اور کارخانوں میں جاکر

اپنا اور اپنے بچوں کے دل کا لہو بادۂ ارغوانی میں تبدیل کرکے خون آشام سرمائے کے جام میں ڈھالتے ہیں

شام کو کارخانے اُگل دیتے ہیں ان کو جُھلسی ہوئی راکھ کا ڈھیر کرکے

اور پھر رات کے وقت طاعون، دق اور سِل کے یہ بھوت موت کے بھیڑیوں کی طرح آتے ہیں اور بھوکے دلوں اور سوکھی ہوئی ہڈیوں کو چبا ڈالتے ہیں

دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں ———

بھوک اور موت کے سائے میں ———

کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

آج "سرمایہ داری" وہ چنچل حسینہ نہیں جس کی بیبا کی پر بوڑھی

۱۰۳۳۵

"جاگیرداری" خفا تھی
جو ہواؤں سے لڑتی تھی طوفان سے کھیلتی تھی
جو سمندر میں دھوتی تھی زلفیں
گوندھ کر ان میں سورج کی کرنیں
صبح سے شام تک ناچتی تھی
اجنبی دیس کے اجنبی ساحلوں پر
قہقہے مارتی تھی
آج "سرمایہ داری"
بوڑھی قحبہ ہے، دلالی ہے پیشہ اس کا
اب وہ اک سانس لیتی ہوئی لاش ہے
سالہا سال سے سڑ رہی ہے
قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ہے
اس نے اپنی جوانی میں اپنی غلط کاریوں سے
کتنے بچے جنے ہیں
بھوک، بیکاری، افلاس، قحط و وبا، جہل، وہم، آتشک، ہینگ
زہریلی گیس اور ایٹم کے بم اس کی گودوں کے پالے
ہوئے ہیں
اب یہ بچے جواں ہو گئے ہیں
زندگی کے لئے اک بلا ہو گئے ہیں

اور سرمایہ واری، کی بوڑھی چھنال ان کی طاقت سے انسانیت
کا لہو پی رہی ہے۔

مریم

ظلم اور جبر پر جی رہی ہے

جاوید

آج ہندوستان میں کوئی خوش نہیں ہے
پیٹ کو روٹی، ہاتھوں کو کام اور تن ڈھانکنے کے لئے چیتھڑے
بھی نہیں ہیں
خالی جو ہاتھ ہوں گے وہ بیکار کب تک رہیں گے؟
اک نہ اک روز تلوار پر جائیں گے
ہونٹ خاموش رہتے نہیں
وہ محبت کے بوسوں اور آسودگی کے ترانوں سے محروم
ہوں گے تو مجبور ہو کر
انقلاب اور بغاوت کے چھیڑیں گے نغمے
اور آزادی کے زمزمے گائیں گے
آج ایک ایک دریا میں طوفان ہے
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
ذرہ ذرہ بغاوت پر آمادہ ہے
سیکڑوں اور ہزاروں مجاہد قدم سے قدم کو ملائے ہوئے بڑھ

رہے ہیں
گولیاں سنسناتی ہیں اُڑتے ہیں پرچم
بادشاہی کے گھر میں ہے ماتم
موت کی چھاؤں میں زندگی رقص فرما رہی ہے

مریم

مرحبا

جاوید

عہد نو آرہا ہے
دولتیں، برکتیں، راحتیں، لذتیں لا رہا ہے
خاک کے بطن میں ان جنی کونپلیں ناچتی ہیں
کھیتیاں لہلہانے کو بیتاب ہیں
گیہوں اور دھان کی نرم ناپیدا شاخیں
رنگ اور نور میں کھیلنے کے لئے مضطرب ہیں
خاک چلا رہی ہے کہ "جاگیردار اور زمیندار نے اپنے ناپاک
قدموں سے مجھ کو نجس کر دیا ہے"

خارزار اور بنجر زمینیں
کہہ رہی ہیں کہ "گنگا کے پانی سے دھو دو ہمیں
پاک اور صاف کر دو ہمیں
تاکہ ہم اپنے مخمل کے پیراہنوں کو پہن کر

"جشن صبحِ بہاراں منائیں"

اور دھرتی کے سینے میں کانوں کے اندر
کتنی دھاتیں ہیں جو کروٹیں لے رہی ہیں
ان کے جوہر میں جنبش ہے اور دل میں ارمان یہ ہے
"کوئی آکر ہمیں قیدِ فطرت سے آزاد کر دے
ہم مشینوں کی صورت میں انساں کی خدمت کریں گے"
ان کی آنکھوں میں اک خواب لہرا رہا ہے
ریشم اور سوت کے کارخانے
ابر کی طرح دھنکی ہوئی روئی کے نرم گالے
ناچتی چرخیاں، گنگناتی ہوئی تکلیاں سینکڑوں رنگ کے تانے بانے
جیسے سورج کی رنگین کرنیں
اپنی لاکھوں لچکتی ہوئی انگلیوں سے
آسمانوں پہ قوسِ قزح کی حسیں چادریں بُن رہی ہوں

ملک کے سنگ اور خشت میں
سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں
کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں

کتنے دیوار و در، کتنے مینار جو سنگ مرمر کے سینے میں سوئے
ہوئے ہیں
جو عدم کے اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہیں
آج انسان کے دستِ تعمیر کے منتظر ہیں
کاش صناع و معمار انھیں ان کے خوابِ گراں سے جگا دیں
سنگ اور خشت کے ڈھیر کو قصر و ایواں بنا دیں
ہم اجنتا کے نقاش، بت گر ایلورا کے، معمار ہیں تاج اور
سیکری کے
ہم وہ صناع ہیں انگلیاں جن کی پتھر کو بھی موم کر کے سبک اور
حسین شکل میں ڈھالتی ہیں
لیکن ان انگلیوں کو
ڈیڑھ سو سال کی مفلسی اور غلامی —
ڈیڑھ سو سال کی کوڑھ نے کھا لیا ہے۔

آج ہندوستاں جاگ اٹھا ہے
یہ حسین بوستاں جاگ اٹھا ہے
اس کی انسانیت اور روحانیت جاگ اٹھی ہے
بچے گہواروں سے رینگ کر آج باہر نکل آئے ہیں
اور انگریز سے اپنا کھویا ہوا بھولا پن مانگتے ہیں

عورتیں اپنی کھوئی ہوئی عصمتیں
مائیں بے آب سینوں کی شادابیاں مانگتی ہیں
دستکار اپنے مضبوط انگوٹھے
اور صناع و معمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں
جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی
کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقان
اپنے دریا و دشت و جبل اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں
یہ حسیں بوستاں ہے ہمارا
سارا ہندوستاں ہے ہمارا
ہم اس اپنے وطن، اپنے گلزار میں، اور کچھ بھی نہیں، صرف
جینے کا حق مانگتے ہیں۔

چوتھی تصویر

آج سے کوچہ و بازار میں مرنا ہے روا
ظلم کی چھاؤں میں چھپ بیٹھ کے جینا ہے حرام

جعفری

چوتھی تصویر

تاریخ کا ترانہ

میں نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
آگ کے پھول، آگ کے گلزار
انکھڑیوں کے دہکتے انگارے
آہ کے شعلے آنسوؤں کے شرار

روم و یونان کے غلام اٹھے
زنجیروں سے جیسے چھوٹ گئے
ظالموں کے محل لرزنے لگے
ہاتھ تھرائے، جام ٹوٹ گئے

آج تک گونجتے ہیں کانوں میں
ہم سے جا گئے کسانوں کے
روح میں میری زخم ہیں پنہاں
عہدِ وسطیٰ کے باغبانوں کے

میں نے دیکھیں طلوع ہوتی ہوئی
غازیوں کی حسین تلواریں
میری آنکھوں کے سامنے بیٹھیں
محبسوں کی بلند دیواریں

میری نظروں کے سامنے گذرے
انقلابِ فرانس کے پرچم
میرے سینے پہ ثبت ہیں اب تک
باغیوں کے جوان نقشِ قدم

میری نبضوں میں، میرے خون میں ہے
جوش زن والگا کا سرخ اُبال
نور افشاں ہے میرے ماتھے پر
روس کے انقلابیوں کا جلال

ہم نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
آگ کے پھول، آگ کے گلزار
انکھڑیوں کے دہکتے انگارے
آہ کے شعلے، آنسوؤں کے شرار

وقت کا ترانہ

تو نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
اب کی اس ملک کی بہار ہے اور
وادیاں گونجتی ہیں نعروں سے
سازو آہنگِ آبشار ہے اور

قافلہ انقلاب کا ہے رواں
بج رہی ہے خوشی کی شہنائی
زلزلوں سے دہل رہی ہے زمین
لے رہے ہیں پہاڑ انگڑائی

سلگ اٹھی ہے انتقام کی آگ
برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں
ظلم اور جبر کے اندھیرے میں

سیکڑوں بجلیاں چمکتی ہیں

جن کو کچلا گیا ہے صدیوں سے
آج تک ان کے دل دھڑکتے ہیں
زندگی کے بجھے ہوئے شعلے
اک نئی شان سے بھڑکتے ہیں

فصل کے ساتھ کھیتوں سے
اگ رہی ہے بغاوتوں کی سپاہ
جگمگاتی ہے عدل کی شمشیر
مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ

کارخانوں کے آہنی دل سے
ایک سیلاب سا اُبلتا ہے
سرخ پرچم ہوا کے سینے پر
بن کے رنگِ شفق مچلتا ہے

یہی ہندوستاں کا ساحل ہے
جس پہ ٹوٹا غرورِ سلطانی

آگ سی لگ گئی ہے پانی میں
موجیں کرتی ہیں شعلہ افشانی

بادباں کھل گئے بغاوت کے
بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے
ایسے جانباز غازیوں کو سلام

دیدنی اہلِ شہر کا ہے شکوہ
گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرے، نگہ میں عزمِ جہاد
حریت ضو فگن جبینوں پر

ہر سڑک پر سمندروں کا اُبال
ہر گلی میں ہے جوشِ طوفانی
غرق کر دے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی

خون چہرے پہ مل کے اٹھی ہے

یہ ہے کشمیر کی دُلھن کا سہاگ
ہر کلی بن گئی ہے چنگاری
شاخِ گل سے نکل رہی ہے آگ

اِن حسیں زعفران زاروں میں
یوں تو ہر سال پھول آتے ہیں
اس برس کاسنی شگوفوں میں
زخم ہی زخم مسکراتے ہیں

جھیل ہے یہ کنول کے پھولوں کی
پاک اور صاف اس کا پانی ہے
مل گیا ہے لہو شہیدوں کا
آج ہر موج ارغوانی ہے

ہے یہ عرصہ گہہ ٹراونکور
ناز کر ناز سر زمینِ دکن
رقص کر رقصِ موجِ بحرِ عرب
مسکرا اے بہادروں کے وطن

وہ اُٹھیں ایک لاکھ بندوقیں
گولیاں ایک لاکھ چلنے لگیں
چھپٹے وہ ایک لاکھ متوالے
ایک لاکھ آندھیاں مچلنے لگیں

رہ گئیں ایک لاکھ سینوں میں
ٹوٹ کر ایک لاکھ شمشیریں
گر گئیں ایک لاکھ جسموں سے
ٹوٹ کر ایک لاکھ زنجیریں

حیدرآباد کے جوانوں کی
فوج میدان میں اُتر آئی
پھر سے ٹیپو کی تیغ جوہر دار
خون میں ڈوب کر اُبھر آئی

بجلیوں کی طرح کڑکتی ہوئی
ٹولیاں آ گئیں کسانوں کی
کیا گھٹا جھوم کر برستی ہے
گونجتے ہیں فتح کے ترانوں کے

شور ہے، جوش ہے، تلاطم ہے
اُڑ گئے ہوش حکمرانوں کے
جاگ اُٹھے ہزار جوالا مکھی
آگ اُبلنے لگی دہانوں سے

اک طرف ظلم، اک طرف انصاف
فوج سے فوج آکے ٹکرائی
جن کے دل میں تھا جوشِ قربانی
آج اُن کی مراد بر آئی

بہہ رہے ہیں جوان جسموں سے
سرخ اور گرم خون کے دھارے
پھوٹ نکلے اُفق کے سینے سے
روشنی کے طلسمی فوّارے

یہ اُنھیں عورتوں کی لاشیں ہیں
جن کے چہروں پہ رنگ تھا نہ نکھار
آج دامن میں کھل رہے ہیں چمن

آنچلوں میں ٹکی ہوئی ہے بہار

خاک پر سو رہے ہیں جو بچے
اپنے ہی خوں میں نہائے ہوئے
ٹامیوں کو شدید نفرت سے
دیکھتے ہیں نظر جمائے ہوئے

یہ ہیں وہ لال جو نشانی تھے
اپنے ماں باپ کی محبت کی
آج سے یادگار ہیں لیکن
ملک اور قوم کی شجاعت کی

مجھ سے کیا پوچھتی ہے اے "تاریخ"
کیا ہے ہندوستان کا تحفا؟
اس دہکتے ہوئے گلستاں سے
ایک دو سرخ پھول لیتی جا

فرنگی

تم کو معلوم ہے یہ جگہ کون سی ہے؟

جاوید

نہیں

فرنگی

یہ وہ ایوان ہے جس میں انصاف، عدل اور صداقت
کی قندیل
سیکڑوں سال سے جل رہی ہے
یہ وہ ایوان ہے جس کے سائے میں ہندوستان کی
رعایا
امن اور چین سے پل رہی ہے
دیکھو دیوار پر شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستان کی
شبیہِ مبارک لگی ہے
جس کی آنکھوں میں رحم اور دل میں محبت بھری ہے
اس کے نزدیک آؤ
ہاتھ اٹھاؤ
اور قسم کھاؤ سچ بولنے کی

مریم

پہلے تم یہ بتاؤ کہ سچائی کی تاب بھی لا سکو گے؟
یہ بڑی تلخ گولی ہے تم کھا سکو گے؟

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ انصاف عدل اور صداقت کی قندیل
ایوان شاہی میں روشن نہیں ہے

مریم

سچ تو یہ ہے کہ انگریز کے ہاتھ میں سچ کا دامن نہیں ہے
سپنوں کو پگھلتے ہوئے، ریگ زاروں میں پھولوں کو کھلتے
ہوئے ہم نے دیکھا نہیں ہے

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ اب کوئی ہندوستانی
شاہ برطانیہ کی رعایا نہیں ہے

مریم

سچ تو یہ ہے کہ انگریز کے ڈیڑھ سو سال کے راج میں
ایک انساں نے بھی امن اور چین پایا نہیں ہے۔

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ یہ اجنبی شخص جس کی شبیہِ مبارک یہاں
لاش کی طرح لٹکی ہوئی ہے
یہ نہ تو شاہ برطانیہ ہے نہ شاہنشہِ ملکِ ہندوستاں ہے
اک فریب، ایک دھوکا ہے، اک وہم ہے، اک
گماں ہے

فرنگی

چپ رہو چپ رہو شاہِ برطانیہ کے غلامو
چپ رہو
اپنا اعمال نامہ سنو

تم نے ـــــ جاوید و مریم
تم نے جمہور کے ساتھ مل کر
انقلاب اور بغاوت کا فتنہ جگایا
تم نے ایک ایک کونے میں طوفاں اٹھایا
تم یہ کہتے ہو جمہور کا راج ہو
ایک اک گھر میں سوراج ہو
کھیتوں میں کسانوں کی ہو حکمرانی
کارخانے ہوں مزدور کی راجدھانی
تم پر الزام یہ ہے کہ تم
شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستاں کی حکومت
سلطنت اور قانون ہی کے نہیں
امن و تہذیب و اخلاق کے بیخ کن ہو
مختصر یہ کہ تم بدچلن ہو

جاوید

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو؟

عصرِ حاضر کے فرعون ہو !
تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی
ایک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خوں ہے
تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے

جب تم اس ملک میں آئے تھے ہم نے مہماں سمجھ کر
اپنی آنکھوں پہ تم کو بٹھایا
بھائی کہہ کر گلے سے لگایا
تم مگر مکر اور فن میں استاد نکلے
بھیس سوداگروں کا بنایا تھا در اصل جلاد نکلے
بھائی سے بھائی کو تم نے آکر لڑایا
خون پانی کی صورت بہایا
اور پھر اپنے آئین و قانون کے نام پر
اونچے قلعے بنائے
فوج لائے
معتبر بانوں پہ پہرے بٹھائے
ظلم اور جبر کے تازیانے لگائے
اور ہندوستاں کی بھری بستیاں لوٹ لیں
تم وہ ہو جن کے ہاتھ اپنے ہی محسنوں کے لہو میں بھرے ہیں

تم تو خود جانتے ہو کہ جس شے کو آئین و قانون کا نام تم نے
دیا ہے وہ کیا ہے
یہ ہے وہ سانپ جو سیکڑوں سال سے ایشیا اور افریقہ
کو ڈس رہا ہے
جس کو لندن کے شاہی مداری
اپنی مکاریوں کی پٹاری میں لے کر
ایک اک ملک میں ایک اک دیس میں پھر رہے ہیں
یہ وہ کوڑا ہے جس کے لگائے ہوئے زخم انسان کے جسم
اور روح میں سڑ رہے ہیں
یہ وہ بجلی ہے جو سالہا سال سے مفلسوں کے گھروں پر
گر رہی ہے
یہ وہ تلوار ہے جو نہتوں کی سوکھی ہوئی گردنوں پر
ڈیڑھ سو سال سے پھر رہی ہے
یہ وہ مخمل ہے جس میں تمھارے تشدد کے خونخوار پنجے چھپے
ہیں
اپنے قانون کا ڈھونگ اچھا رچایا ہے تم نے
جابرانہ حکومت کا اچھا بہانہ بنایا ہے تم نے
لیکن اس ملک میں ایسے قانون کی دھجیاں اڑ چکی ہیں

ہم نے اپنے تڑپتے ہوئے دل کے جلتے ہوئے خون سے اپنی
بے غیرتی اور محکومیت کی سیاہی کو دھو
ڈالا ہے
اب یہاں ایک آئین ہے ایک قانون ہے
جس کو جمہور نے انقلاب اور بغاوت کی بھٹی میں پگھلا کے اپنے
عزم کے سانچے میں ڈھالا ہے

فرنگی

اور جاوید کی بیوی مریم
تم کو کیا کہنا ہے؟

مریم

جب سے تم آئے ہو گھر کی سب برکتیں اُٹھ گئی ہیں
تم نے ہندوستان کی لہکتی ہوئی کھیتیوں سے
ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں
تم نے اس ملک کے سبزہ زاروں کی شادابیاں چھین لی
ہیں
تم نے پھولوں کو کھِلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا
تم نے چشموں کو بہنے سے، فواروں کو رقص کرنے سے روکا
اور دریاؤں میں زہر گھولا

کل جہاں ناچتی تھیں بہاریں
دودھ اور شہد کی پڑ رہی تھیں پھواریں
آج ان وادیوں اور میدانوں میں قحط و افلاس کے بھوت
منڈلا رہے ہیں
اور آئین و قانون کے گِدھ ہمارے
جسم کی بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں

تم کو معلوم ہے آج کیوں نوجواں عارضوں کے کنول مسکراتے
نہیں ہیں؟
چاند سے ماتھے، سورج سے مکھڑے
کس لئے جگمگاتے نہیں ہیں؟
تم نے بچپن کے پھولوں سے خوشبو چرا لی
اور جوانی کے آئینے سے اس کی رونق اڑا لی
تم نے ہنستی ہوئی مانگ اور مسکراتی جبینوں سے افشاں چھڑا لی
صندلی ہاتھوں سے ان کا رنگ حنا لے لیا ہے

جاوید

پھر بھی تم امن و تہذیب و اخلاق کا نام لے کر
اک نیا جال پھیلا رہے ہو
ساری دنیا کو بہکا رہے ہو

مریم

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
امن و تہذیب کا نام کس نے مٹایا
کس نے دکھیاری ماؤں کے گڑیل جوانوں کو توپوں کا ایندھن
بنایا
کس نے شہروں کو اور بستیوں کو جلایا
کس کے بمبار برسوں سے دنیا کے سر پہ
موت کی راگنی گا رہے ہیں
کس کے لشکر ہیں جو غیر ملکوں میں طاعون پھیلا رہے ہیں

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
کس نے قبروں کو کھدوا
اور لاشوں کو باہر نکالا
کس نے لاشوں کے ٹکڑے کئے، کس نے مُردوں کے کوڑے
لگائے
کس نے آئین و قانون کے نام پر سولیاں گاڑ دیں
اور پھانسی کے پھندے بنائے
کس نے ماؤں کی گودوں سے بچوں کو چھینا
چیر کر کس نے معصوم بچوں کا سینہ

نرم، نازک، دھڑکتے دلوں کو چھپایا

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
ملک میں انقلاب اور بغاوت کا طوفان کس نے اٹھایا
تم جسے جُرم کہتے ہو وہ اصل تہذیب ہے اصل اخلاق ہے
ظالموں کے خلاف انقلاب اور بغاوت
آدمیت کی معراج ہے
آدمیت کی معراج ہے

جاوید
ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں ہے
ایک بھی ذرہ اس ملک میں اب تمھارا نہیں ہے
آج پیڑوں کے پیروں میں جنبش ہے کہسار چلنے لگے ہیں
ریگ زاروں کے سوکھے ہوئے زرد سینوں سے سیلاب
اُبلنے لگے ہیں
کھیتیاں خاک کی گود سے اُٹھ رہی ہیں
اب کی سال ان کی شاخوں میں ہنسئے پھلے ہیں
کارخانے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں ہتھوڑے
اُٹھائے ہوئے آرہے ہیں
اور لوہے کے پہیئے۔

وقت وتاریخ کے تیز رفتار پہیوں کے مانند
انقلاب اور بغاوت کی رتھ میں لگے فتح کی راگنی گارہے ہیں

دیکھو کتنی ہی فوجیں اُفق سے
آندھیوں کی طرح آرہی ہیں
بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں
بل پہ بل کھا رہی ہیں
یہ وہ روحیں ہیں جو رودِ کاویری کے ساحلوں پر
اور پلاسی کے میدان میں سیکڑوں سال
سے سو رہی تھیں
یہ وہ اجسام ہیں غدر کے وقت جن کو
اپنی توپوں سے باندھا تھا تم نے
یہ وہ لاشیں ہیں جن سے ہزاروں کنوؤں اور گڈھوں کو پاٹا
تھا تم نے
یہ وہی سر ہیں تم نے جنھیں گردنوں سے جدا کر دیا تھا
یہ وہی گردنیں ہیں جنھیں تم نے پھانسی کا پھندا دیا تھا
یہ وہی ہاتھ ہیں جن میں اب تک
آہنی ہتھکڑی کے نشاں ہیں
یہ وہی پیر ہیں جن میں اب تک تمھاری پہنائی ہوئی

بیڑیاں ہیں

یہ وہی سینے ہیں جن میں دل کی جگہ سیسے کی گولیاں سو رہی ہیں

یہ وہی دل ہیں جن کے ہر اک زخم میں زہر آلود سنگینوں کی ٹوٹی نوکیں پڑی رو رہی ہیں

دیکھو کتنی ہی فوجیں اُفق سے
آندھیوں کی طرح آ رہی ہیں
بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں

بھاگو بھاگو

اپنا جسم، اپنی جان، اپنا امن، اپنا اخلاق و تہذیب و قانون سب لے کے بھاگو
اس زمیں کے دہکتے ہوئے سینے سے سلطنت کی پرانی بساط اب اٹھا لو
زندگی تم سے تنگ آ چکی ہے
ساری دنیا اب اُکتا چکی ہے
موت کے بادباں کھول دو اور اپنے جہازوں کے لنگر اُٹھا لو

جاؤ۔ جاؤ

فرنگی

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم کو
اپنے سارے جرائم کا اقرار ہے

جاوید

ہم کو انکار ہے

مریم

ہم کو انکار ہے

فرنگی

پر یہ انکار قانون کی منصفانہ نگاہوں میں اقرار ہے

جاوید

انقلاب اور بغاوت کا اقرار لیکن جرائم سے انکار

مریم

انکار ہے

فرنگی

تم اسی طرح انکار کرتے رہو گے
پھر بھی قانون کا فیصلہ فیصلہ ہے
تم نے ـــــ جاوید و مریم
تم نے جمہور کے ساتھ مل کر

انقلاب اور بغاوت کا فتنہ جگایا
تم نے ایک ایک کونے میں طوفاں اٹھایا
تم یہ کہتے ہو جمہور کا راج ہو
ایک اک گھر میں سوراج ہو
کھیتوں میں کسانوں کی ہو حکمرانی
کارخانے ہوں مزدور کی راجدھانی
تم پہ الزام یہ ہے — کہ تم
شاہ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستاں کی حکومت
سلطنت اور قانون ہی کے نہیں
امن و تہذیب و اخلاق کے بیخ کن ہو
اس لئے شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستان کی عدالت
سے تم کو
تم کو جاوید
یہ سزا دی گئی ہے کہ سرکار نے تم سے جینے کا حق لے لیا ہے

جاوید

مجھ سے کیا، سارے ہندوستان سے یہ حق، جب سے تم
آئے ہو چھن چکا ہے

فرنگی

... ... تم سے جینے کا حق لے لیا ہے

اب تمھارے لئے قید خانے میں ریشم کا پھندا لگا ہے
تا کہ اس میں تمھارا گلا باندھ کر تم کو پھانسی پہ لٹکایا جائے یہاں
تک کہ دم توڑ دو
شاہ برطانیہ اور شہنشاہ ہندوستاں کی
سلطنت چھوڑ دو

جاوید

اور تم ہم غریبوں کے ہندوستان کی
مملکت چھوڑ دو

فرنگی

اور تم کو
تم کو مریم
یہ سزا دی گئی ہے کہ تم عمر بھر
عمر بھر صرف رویا کرو
اپنے اشکوں سے اپنے گناہوں کو دھویا کرو
یہ وہ ایوان ہے جس میں انصاف عدل اور صداقت
کی قندیل
سیکڑوں سال سے جل رہی ہے
یہ وہ ایوان ہے جس کے سائے میں ہندوستان کی
رعایا

امن اور چین سے پل رہی ہے

مریم

ایسے ایوان عدل و صداقت پہ لعنت
ایسی ظالم حکومت پہ لعنت

(دیر تک آواز گونجتی رہتی ہے)

لعنت، لعنت، لعنت

پانچویں تصویر

آج کی رات اور باقی ہے

مجازؔ

پانچویں تصویر

موت کا راگ

ہر چیز آنی، ہر چیز جانی
ہر رنگ فانی، ہر نقش فانی
دنیا پریشاں خوابوں کی بستی
رنگیں فسانہ، غمگیں کہانی

سازِ ازل کا نغمہ اجل ہے
شمعِ جہاں کا جلوہ اجل ہے
رقصاں اجل کی پرچھائیاں ہیں
پنہاں اجل ہے پیدا اجل ہے

نکہت ہو گل کی تاروں کی ضو ہو
موجِ نظر ہو، بجلی کی رَو ہو
چلتا ہے سب پر جادو اجل کا
نقشِ کہن ہو یا نقشِ نو ہو

ہر پھول بے بس، ہر خار بے بس
ہر ساز بے بس، ہر تار بے بس
پنجے سے میرے کوئی نہ چھوٹا
تسبیح بے بس، زنّار بے بس

آنکھوں کا کاجل اشکوں سے دھویا
میں نے خوشی کو غم میں بھگویا
بچ کر نہ نکلا کوئی سفینہ
سب کو ڈبویا، سب کو ڈبویا

قیدی ہیں گورے، قیدی ہیں کالے
انسان و حیوان میرے نوالے
محفل میں میری کرتے ہیں گردش
خوں کے پیالے خوں کے پیالے

چنگیز و تیمور، نشتر ہیں میرے
خاقان و فغفور خنجر ہیں میرے
میرے پھریرے قحط اور وبائیں
ظلم اور افلاس لشکر ہیں میرے

مجھ کو زمانہ کہتا ہے سفاک
میری نگاہیں سرد اور بیباک
ہر وار بھرپور، ہر وار بھرپور
دستِ اجل ہے چست اور چالاک

لیکن فرنگی میرا بھی استاد
مجھ سے بھی بڑھ کر سفاک و جلاد
سہمی ہوئی ہے دیوارِ زنداں
پھانسی کے پھندے کرتے ہیں فریاد

مریم کی آواز

زندگی ایک بارِ گراں ہے

میرا جاوید آخر کہاں ہے؟

جاوید

آ مرے پاس آ میری مریم
میری غم خوار و دلدار و ہمدم
میں سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوں
راہ کب سے تری تک رہا ہوں

(مریم سامنے آتی ہے)

فرض اپنا ادا کر چکا ہوں
دامنِ شوق کو بھر چکا ہوں
بوجھ کوئی نہیں قلب و جاں پر
فخر کرتا ہوں ہندوستاں پر
میرے دل میں نہ ڈر ہے نہ غم ہے
آنکھ تیری محبت میں نم ہے
دل میں بس ایک ہی آرزو تھی
دیکھ لیتا بھری گود تیری

مریم

(آگے بڑھ کر)

کوئی دیوارِ زنداں کو ڈھا دے
اِن سلاخوں کو پیچھے ہٹا دے

(سلاخوں کو زور سے ہلاتی ہے)

جاوید

کیوں یہ آنکھیں تری لال کیوں ہیں ؟
اتنے اُلجھے ہوئے بال کیوں ہیں ؟
کیوں ہے غمگین صورت بنائی؟
رُخ پہ کیوں اُڑ رہی ہے ہوائی ؟
نظریں اس طرح کیوں بجھ گئی ہیں ؟
ہاتھ میں چوڑیاں کیوں نہیں ہیں ؟
تیرے چہرے پہ افسردگی ہے
تیرے لہجے میں پژمردگی ہے

مریم

میرے دل میں محبت ہے تیری

جاوید

تیرے ہی ہاتھ عزت ہے میری
روک لے آنسوؤں کی روانی
پھیر قربانیوں پر نہ پانی

مریم

تجھ سے کہتی ہوں پھیلا کے آنچل
مجھ کو بھی اپنے ہی ساتھ لے چل

جاوید

مجھ کو مت دیکھ، دیکھ اس چمن کو
لٹ گئی ہے جو اس انجمن کو
دیکھ اے جانِ ہندوستاں کو
اپنے اُجڑے ہوئے بوستاں کو
جس کے ہر گل پہ رنگِ خزاں ہے
جس کا ہر برگ و بر نوحہ خواں ہے
گھر کے آئے اگر ابرِ باراں
خاک سے پھوٹے رنگِ بہاراں
آنسوؤں کی نہیں کوئی حاجت
اس کو ہے گرم خوں کی ضرورت

مریم

میرے سر میں بھی آخر جنوں ہے
میری نبضوں میں بھی گرم خوں ہے
موت کا مجھ کو پیغام آتا
کاش میرا لہو کام آتا

جاوید

سُرخ رُو ہو گی اک روز تو بھی
کام آئے گا تیرا لہو بھی

یوں گذرنا ہی سب کچھ نہیں ہے
صرف مرنا ہی سب کچھ نہیں ہے
اور بھی ہیں بہت سے طریقے
خدمتِ ملک و قوم و وطن کے

مریم

جا کے دوں کس کے در پر دُہائی
شاق ہے مجھ کو تیری جدائی
آہ کل تو بہت دور ہو گا
میری نظروں سے مستور ہو گا
سوگ چھا جائے گا زندگی پر
اوس پڑ جائے گی ہر خوشی پر
دکھ اٹھاؤں گی صدمے سہوں گی
عمر بھر اب اکیلی رہوں گی
مجھ کو ہر وقت یاد آئے گا تو
میرے خوابوں میں لہرائے گا تو
آنسوؤں میں چمکتا رہے گا
میرے دل میں دھڑکتا رہے گا
شرم ہے اپنی ناکامیوں پر
فخر ہے تیری قربانیوں پر

لیکن اس دل کو سمجھاؤں کیسے؟
میں تجھے چھوڑ کر جاؤں کیسے؟
جشنِ نو آئے گا جب وطن میں
ہوں گی تنہا بھری انجمن میں

جاوید

کل کا انداز کچھ اور ہو گا
بزم میں اک نیا دور ہو گا
جنگ ہو گی نہ پیکار ہو گی
تو مسرت سے سرشار ہو گی
گود میں تیری اک چاند ہو گا
جس سے خورشید بھی ماند ہو گا
جب جوانی کا انعام پاتا
اس کو میری طرح کا بتانا
اس طرح مجھ کو پا جائے گی تو
پھر نہ اک پل بھی گھبرائے گی تو
کتنی دلچسپ ہے یہ کہانی
مٹ کے بنتی ہے پھر زندگانی

ساری انسانیت اک تڑپتا ہوا شعلہ ہے

اور افراد چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں کتنے ہی بیباک و بے تاب شعلے
پرورش پا رہے ہیں
اس تڑپتے ہوئے شعلے سے
جتنی چنگاریاں ٹوٹتی ہیں
اتنی ہی اور چنگاریاں پھوٹتی ہیں
اس طرح زندگی
گل بہ آغوش چنگاریوں سے
ہر گھڑی
اک نیا اور مہکتا ہوا ہار اپنے لئے گوندھتی ہے۔

کچھ تو چنگاریاں ایسی ہیں جو بھڑکتی نہیں ہیں تڑپتی نہیں ہیں
صرف اُڑتی ہیں اور ناچ کر ایک لمحے میں کھو جاتی ہیں
موت کی سرد آغوش میں جا کے سو جاتی ہیں
لیکن ایسی بھی کتنی ہی چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں سے شعلے بھڑکتے ہیں اور خار و خس پہ
لپکتے ہیں اور بجھتے بجھتے بھی دنیا اور انسانیت کو
رنگ اور نور کے ایک طوفان میں غرق کر جاتے ہیں

گرمیٔ بزم صرف ایک رقصِ شرر تک نہیں ہے

ہم نسیمِ سحر کی طرح آتے ہیں باغِ انسانیت میں
دو گھڑی سبزہ و گل سے اٹھکھیلیاں کرتے ہیں
شاخ پر جھولتے ہیں
کنج کے سائے میں کھیلتے ہیں
اور گلوں کو
رنگ و بو دے کے اس باغ سے رقص کرتے چلے جاتے ہیں

ابر کی طرح چھاتے ہیں دنیا کے سر پر
اور پھر سبز کھیتوں کو سیراب کر کے
وادی و دشت و کوہ و بیاباں کو شاداب کر کے کڑکتے،
گرجتے، برستے، گذر جاتے ہیں

ہم ہمیشہ سے لمحوں کے مانند آتے رہے ہیں
اور آتے رہیں گے
لمحے جو وقت کی وسعتِ بیکراں سے امنڈتے ہیں اور ڈوب
جاتے ہیں پھر وقت کی وسعتِ بیکراں میں
یوں تو سب لمحے ہیں ایک سے

ایک سی ان کی رفتار ہے
ایک سی ان کی جھنکار ہے
پھر بھی یکساں نہیں ہیں
جو بھی لمحہ ہے وہ اک نئی آرزو ہے
اک نئی جستجو ہے
اک نیا ساز ہے اک نیا سوز ہے
اک نئی جوت ہے اک نئی روشنی ہے

ہم ہیں انسانیت کے زمانے کے موسم
جو بدلتے رہے ہیں
اور بدلتے رہیں گے
جو نئے پھول پھل ساتھ لاتے رہے ہیں
اور لاتے رہیں گے
جو نئے رنگ سے کیاریوں کو سجاتے رہے ہیں
اور سجاتے رہیں گے
جو نئی کونپلوں کے نئے پیرہن
شاخساروں کو ہر سال لاکر پنہاتے رہے ہیں
اور پنہاتے رہیں گے
ہم زمانے کے دریا سے موجوں کی صورت ابھرتے رہے ہیں

اور ابھرتے رہیں گے
زندگانی کی کشتی کو ہم اپنے سبال سینے پر لے کر
آگے بڑھتے رہے ہیں
اور بڑھتے رہیں گے
اس سفینے کے ملاح روز ازل سے بدلتے رہے ہیں
اور بدلتے رہیں گے
بادباں بن کے افراد اُٹھتے رہے ہیں
اور اُٹھتے رہیں گے
یہ حسیں ناؤ انسانیت کی اسی طرح چلتی رہی ہے
اور چلتی رہے گی

ہم ہیں معمار انسانیت کے
اپنے آبا و اجداد معمار تھے
ہم بھی معمار ہیں
آنے والے زمانے کی نسلیں بھی معمار ہوں گی
زندگی کا فلک بوس ایوان اسی طرح بنتا رہا ہے
اور بنتا رہے گا
ہم جہاں اپنی صناعیاں ختم کر کے چلے جائیں گے
کل وہیں سے نئے عہد کے حوصلہ مند صناع

اپنے فن اور صنعت کا آغاز آ کر کریں گے

ہم اسی طرح آتے رہے ہیں
ہم اسی طرح جاتے رہے ہیں
ہم اسی طرح آتے رہیں گے
ہم اسی طرح جاتے رہیں گے
ہم اگر کل نہ ہوں گے تو کیا وقت کی تیز رفتار رک جائے گی؟
زندگی کی کمر بوجھ سے غم کے جھک جائے گی؟
گردش ماہ و انجم میں کیا فرق آجائے گا؟
کیا اندھیرا زمانے پہ چھا جائے گا؟

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر
زندگی مسکراتی رہے گی
اپنی شمعیں جلاتی رہے گی
آسمانوں کا فیروزی رنگ اتنا ہی دلکش رہے گا
اور اُفق کی جبیں روشنی سے چمکتی رہے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
اپنے محور پہ گھوما کرے گی
اور فضاؤں کی لا انتہا نیلی پہنائیوں میں

آج کی طرح سے کل بھی جھوما کرے گی
چاند تاروں کا سیلِ رواں اس کے سر سے گذرتا رہے گا
آج کی طرح کل بھی زمیں کی
آرتی بزمِ انجم اتارا کرے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
چشمۂ نور میں غسل کر کے
سرخ سورج کے آئینے میں اپنی زلفیں سنوارا کرے گی

ہاں مگر آج اور کل میں اک فرق ہوگا
زندگی کل کی بھرپور ہوگی
کامرانی کی مے پی کے مخمور ہوگی
کل یہ لوہے کی موٹی سلاخیں
جو مرے اور ترے درمیاں ہیں پگھل جائیں گی
ظلم اور جبر کی ساری زنجیریں گل جائیں گی
کل غلامی کی لعنت، غریبی کی ذلت، مصیبت، مشقت،
صعوبت، عداوت، جہالت
وہم کی بادشاہت، بہیمانہ خصلت، درندوں کی سی ظالمانہ عادت
جبلت
خار و خس کی طرح آدمیت کے طوفاں میں بہہ جائے گی

آدمیت کا طوفان روزِ ازل سے امنڈ تا رہا ہے
اور ابد تک امنڈتا رہے گا
یہ وہ طوفان ہے جس کے ریلے میں فطرت کی سفاکیاں بہہ
گئی ہیں
جس کی موجوں میں فرعون و تیمور و چنگیز کی ہستیاں بہہ
گئی ہیں
یہ وہ طوفان ہے جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے
گرجتا رہا ہے
اور گرجتا رہے گا

ہم جو برطانوی سلطنت کی
کھوکھلی اور پرانی چٹانوں سے ٹکرا رہے ہیں
ہم بھی انسانیت کے اسی جاودانی سمندر کی اک موج ہیں
زندگی، ارتقا اور تاریخ کی فوج ہیں
ہم بڑھیں گے تو تاریخ آگے بڑھے گی
ظلم اور جبر کی قوتوں سے لڑے گی
آج جس سمت میں ہم مڑیں گے اسی سمت میں ساری دنیا
مڑے گی

زندگی سرخ شہپر لگا کر اُڑے گی

ہم ہیں وہ موجِ طوفاں کہ جو بڑھ کے گھٹتی نہیں ہے
لاکھ دشمن ہوں لیکن ہماری سپہ پیچھے ہٹتی نہیں ہے

جب سے انسان نے اپنے نقشِ قدم سے
پشتِ گیتی پہ عظمت کی مہریں لگائی ہیں اس وقت سے
ساری فطرت
آدمیت سے لڑنے پر آمادہ ہے
سوچ ان مرحلوں کو
سوچ ان راستوں اور ان منزلوں کو
جن سے انسان اب تک گذرتا رہا ہے
اس کا ہمدرد و غم خوار کوئی نہ تھا
اس کا دلدار کوئی نہ تھا
ہر طرف صرف دشمن ہی دشمن نظر آرہے تھے
وادیاں، دشت، میداں، پہاڑ
اپنے دامن سمیٹے ہوئے تھے
دیو کی طرح سے سانس لیتے سمندر
اپنے سیال جسموں کو جھاگ اور طوفان کی چادروں میں

پلیٹے ہوئے تھے
اپنے تاریک سینوں میں جنگل
اپنے اسرار اور بھید سب کچھ چھپائے کھڑے تھے
اونچے اونچے درخت اپنے میٹھے پھلوں کو
آدمی کی پہونچ سے بہت دور سر پر اٹھائے کھڑے تھے
کوہساروں کی نیلی چٹانیں
اور زمیں کی سنہری تہیں
اپنی گہرائیوں میں ہزاروں خزانے دبائے ہوئے تھیں
ندیاں غیظ میں پیچ و خم کھا رہی تھیں
سانپ کی طرح لہرا رہی تھیں
بجلیاں کالی کالی گھٹاؤں میں اپنی
آتش افشاں زبانوں سے پھنکارتی تھیں
زلزلے آتے تھے
برف اور آگ کے سخت طوفان چھاتے تھے اور چاند
سورج ستارے
ان میں کھو جاتے تھے
لیکن ان سیکڑوں دشمنوں کی
دشمنی کے اندھیرے میں انسان
اپنے ہاتھوں میں محنت، عمل اور تجسس کی قندیل لے کر

درد، دکھ، شوق، ارماں، مسرت، امنگ، آرزو، اور امید
کا بوجھ سر پہ اٹھائے ہوئے
آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا
اور ہر ہر قدم پہ
کامرانی کے اور کامیابی کے پرچم
نصب فرما رہا تھا

آخرش وادیاں، دشت، میداں، پہاڑ اس کے قدموں
کے نیچے
فرش کی طرح سے بچھ گئے
ندیاں اس کے فاتح قدم چومنے کے لئے رک گئیں
اونچے اونچے درختوں کی اونچی ثمردار شاخیں
اس کی تسلیم کو جھک گئیں
برف کی چوٹیاں اس کی تعظیم کو جھک گئیں
کوہساروں کی دولت
آبشاروں کی طاقت
اور زمیں کے خزانے
اس کی خدمت میں حاضر ہوئے
اور انساں ہواؤں پہ اڑنے لگا

موج طوفاں پہ چلنے لگا
بجلیاں اس کی آغوش میں آ گئیں اور دنیا
ذہن انساں کے انوار سے جگمگانے لگی
سازِ تمدن اٹھا اور تہذیب گانے لگی

سوچ ان مرحلوں کو
سوچ ان راستوں اور ان منزلوں کو
جن سے انسان اب تک گذرتا رہا ہے
اس کی راہوں میں دونوں طرف ڈھیر تھے ہڈیوں کے
اور ہر ہر قدم پر
خوں میں لتھڑے بُریدہ سروں کے فلک بوس ٹیلے کھڑے تھے
جن کی چوٹی پہ راتوں کو بھوت اور جنات
اپنی محفل سجاتے تھے اور آتشیں حلقوں میں ناچتے تھے
اور تاریخ کے سبزہ زاروں میں بہتے ہوئے خون کی تیز بو سے
ہواؤں کا دم گھٹ رہا تھا

یہ پرانے زمانے کے ان حکمرانوں کے نقشِ قدم تھے
جن کی سفاکیوں کے فسانے

آج بھی دل کو دہلا رہے ہیں
لیکن انسان ان مرحلوں سے گذر کر
آج ان منزلوں پر کھڑا ہے جہاں ہر خزاں کے عقب سے
بہاریں گل افشانیاں کر رہی ہیں
اور غم کے اندھیرے افق سے مسرت کی چھنتی ہوئی تیز کرنیں
رنگ اور نور سے دشت و کہسار کی گودیاں بھر رہی ہیں

اپنے اُجڑے ہوئے ملک کی کھیتیاں لہلہائیں گی شاداب ہو کر
دھان کی بالیاں مسکرائیں گی گیہوں کے خوشوں میں تارے پھلیں گے
اور دھرتی کے سینے سے پھولوں کے فوارے ابلیں گے

مریم

جن میں نہائیں گے ہم

جاوید

آسمانوں سے اُتریں گی رنگیں بہاروں کی پریاں
دور ہو جائیں گی قحط کی کالی پُر ہول پرچھائیاں
ہر طرف نور ہی نور ہی نور ہوگا

نورہی نور ہو گا

مریم

میرے جاوید کی تیز آنکھوں کا نور، اس کے سینے سے بہتے
ہوئے خون کا رنگ

جاوید

کارخانوں سے نغموں کے طوفاں اٹھیں گے
اور غریبوں کے سوکھے ہوئے زرد چہروں پہ رنگ آئے گا
زندگی اور آسودگی کا
ان کی مغموم آنکھیں خوشی کی نئی روشنی سے چمکنے لگیں گی

مریم

ہجر کی لمبی راتوں کے آنسو محبت کے ہلکے تبسم میں شہد و شکر
بن کے گھل جائیں گے

جاوید

گرد آلود آئینے دُھل جائیں گے
اور ماؤں کی گودوں سے ہنستے ہوئے ننھے ننھے فرشتے اتر
کر زمیں پر چلیں گے
جس طرح باغ میں پھول، آکاش پر چاند تاروں کے جھرمٹ
سبز مخمل کی وادی میں شبنم کے شفاف قطرے
اور چالیس کروڑ آدمی، وہ جو ہلکی سی اک مسکراہٹ سے محروم تھے

اس طرح کھلکھلا کر ہنسیں گے کہ جس طرح جوالا
مکھی پھوٹتا ہے
اور یہ قہقہہ، ایک آزاد، بیباک، ابھرتی ہوئی قوم کا قہقہہ
آسمان و زمیں پر
نور بن کر بکھر جائے گا

مریم

سارا عالم سنور جائے گا

جاوید

سچ بتا اب بھی غمگیں ہے تو؟

مریم

ہاں میں غم گین ہوں، اب بھی غمگین ہوں، اب بھی غمگین ہوں
آہ یہ غم ہمیشہ مرے دل میں پلتا رہے گا
میری روتی ہوئی آنکھوں سے اشک بن بن کے ڈھلتا
رہے گا
کون ہے وہ جو پتھر کے سینے سے وزن اور دہکتے ہوئے سرخ
انگاروں کے دل سے ان کی تپش چھین لے گا؟
کون ہے وہ جو دل کی ہری شاخ سے غم کے چبھتے ہوئے
کانٹوں کو بین لے گا؟
یہ جدائی نہیں بلکہ وہ درد ہے جس کی ٹیسیں

عمر بھر میرے پہلو میں اُٹھتی رہیں گی
آہیں سینے میں گھٹتی رہیں گی

جاوید

لیکن انسان کی روح سے غم کے دھبے
وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈھل جاتے ہیں
کشتیٔ زندگانی کے لپٹے ہوئے بادباں
آنے والی مسرت کی ٹھنڈی ہواؤں سے کھُل جاتے ہیں

مریم

پھر بھی بچھڑے ہوئے دوست احباب ملتے نہیں ہیں
ہاں تسلی سے تھوڑی سی تسکین ہوتی ہے لیکن
قلب اور روح کے زخم سِلتے نہیں ہیں
رات کی تیرگی میں
پھول شبنم کے بوسوں سے مدہوش ہوتے ہیں۔ کھلتے
نہیں ہیں
چاند کی کرنیں جب اپنی نرم اور نازک
سیم گوں انگلیوں سے
رات کے اُلجھے اُلجھے ہوئے ریشمی بال سلجھانے لگتی ہیں تو
اس کی نیلی رگوں میں
چاندنی خون کی طرح سے دوڑ جاتی ہے لیکن

پھر بھی اس کی جبیں سے اندھیرے کی پرچھائیں ہٹتی نہیں
ہے
ہاں تسلی سے تھوڑی سی تسکین ہو جاتی ہے
لیکن اس کے سہارے
عمر کٹتی نہیں ہے

جاوید

یہ زبانی تسلی نہیں
بلکہ ایسی حقیقت ہے جو تیری آغوش میں پرورش پا رہی ہے
جو تری روح اور دل کو گرما رہی ہے
ہاں یہ سچ ہے کہ میں آج پھانسی کے پھندے کے نیچے
کھڑا ہوں
ایک برگِ خزاں ہوں
تجھ کو جتنا بھی غم ہو وہ کم ہے
تو مگر ایک کھلتا ہوا پھول ہے
ایک پھلتی ہوئی شاخ ہے
جس کے ایک اک رگ و ریشے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں
تو مسرت کا پیغام ہے
ملک اور قوم کی آرزو کا چھلکتا ہوا جام ہے
اپنے سینے میں تو عہدِ نو کی بشارت چھپائے ہوئے ہے

زندگانی کا بارِ امانت اُٹھائے ہوئے ہے

... ...

(خاموشی)

(صرف ساز بجنے کی آواز)

رات کو میں نے اک خواب دیکھا
گود میں تیری مہتاب دیکھا
رات تاریک تھی اور سلاخوں کے باہر
آسماں ابر آلود تھا
ہر طرف موت کی سی خموشی ــــ
گویا پتھر کی اک سِل تھی جو جیل کی رات کے دل پہ رکھی ہوئی تھی

میری تنہائی میں میری ہمدم بس اک ٹمٹماتی ہوئی شمع تھی
جس نے چھت اور دیوار پر
ہلکے ہلکے سے اک نور کا جال پھیلا دیا تھا
جیسے مایوسیوں کے اندھیرے میں امید کی جھلملاتی ہوئی روشنی
ہو
میں تھا، یہ کوٹھری اور سلاخیں
جن کی پرچھائیاں صحن کی خاک پر لیٹ کر سو گئی تھیں

اتنے میں نیند آئی

اپنی آنکھوں میں صدیوں کا کاجل لگائے ہوئے

اپنے آنچل میں سکھ کے تارے چھپائے ہوئے

جیل کے پاسبانوں سے بچتی ہوئی

ہر قدم پر دلھن کی طرح سے ٹھٹکتی، جھجکتی ہوئی

آہٹیں سن کے دیوار کی آڑ لے کر دبکتی ہوئی

چپکے سے کوٹھری میں چلی آئی اور میرے سینے پہ سر رکھ دیا

اپنی کالی گھنی زلف کو میرے شانوں پہ پھیلا دیا

آسماں کی بلندی سے نیلی گھٹائیں اترنے لگیں

اور پرچھائیاں سی بکھرنے لگیں

ہر طرف تیرگی چھا گئی

سنتری، پاسباں، کھوری دیواریں، چھت اور سلاخیں

شمع اور شمع کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی

ایک پرکیف و مخمور اندھیرے میں گم ہو گئیں

نیند کی مدھ بھری گود میں سو گئیں

نیند ہے اک حسینہ

سرمئی آنکھیں ہیں نیلگوں اس کا سینہ

اس کی پلکوں کے سائے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں

کھیلتی ہیں
وہ غریبوں کی غم خوار دکھیوں کی دلدار ہے
اور فرقِ مراتب سے بیزار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سُلا جاتی ہے
بچوں کو لوریاں دیتی ہے، پھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے
عالم پہ جادو بھری انگلیوں سے چھڑکتی
ہے شبنم
اس طرح بزمِ فطرت کی ہر چیز کو
اک نئی زندگی بخشتی ہے
اک نئی تازگی بخشتی ہے

رات وہ مجھ کو اپنے سبک بازوؤں میں اُٹھا کر
جبل سے لے گئی
دور احساس و ادراک کی سرحدوں سے بھی دور
ایک افسانوی سرزمیں تھی
ماضی و حال کی سوتی اور جاگتی وادیوں میں
خواب آلود ہلکے دھندلکے کے ایوان
چاندنی کے ستون اور شفق رنگ محرابیں، پیشانیاں

جن کی عقدِ ثریّا سے آراستہ تھیں
واں نہ یہ جیل تھی اور نہ اس جیل کے پاسباں تھے
اور نہ یہ سخت اور سرد دیواریں تھیں
اور نہ پُرہول تنہائی تھی
خواب کی خلوتیں انجمن بن گئی تھیں
کتنے بھُولے ہوئے چہرے، بسری ہوئی آنکھیں گذرے
ہوئے ماہ اور سال کے مسکراتے اُفق سے اُبھر
آئی تھیں
کتنی آوازیں خاموشی کے ساز سے پھوٹتی تھیں
اک عجب رقص تھا اک عجب زمزمہ تھا
ساغروں کی کھنک، بانسری کی پگھلتی ہوئی لے، ہواؤں کی
سرگوشیاں
دوب کے فرش پر شبنم آلود ملبوس کی سرسراہٹ
چاند تاروں کے گیت اور سیاروں کی گنگناہٹ
وقت کے پاؤں کی نرم آہٹ
قہقہوں کی صدا اور کلیوں کے کھلنے کی آواز
سب کی سب ایک پرکیف نغمے میں حل ہوگئی تھیں

ناگہاں جنگ کے طبل بجنے لگے

اور کروڑوں قدم ایک آہنگ کے ساتھ اُٹھنے لگے
آسماں ہل گیا اور زمیں تھرتھرائی
زندگی تلملائی
اور کوہ ہمالہ
اپنے ہاتھوں میں ہندوستاں کے علَم کو اُٹھائے ہوئے بڑھ رہا تھا
اور اُس کی جلو میں
ساری انسانیت
ایک غضب ناک سیلاب کی طرح اُمڈی چلی آ رہی تھی
سارے ہندوستاں کے بہادر مجاہد
اپنے سر کو ہتھیلی پہ رکھے ہوئے
اپنے دشمن سے ٹکرا رہے تھے
سرخ اور سبز پرچم
ترنگے کے پہلو میں لہرا رہے تھے
گولیاں چل رہی تھیں
لاکھوں سینوں سے جلتے ہوئے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں
پھر بھی کوہ ہمالہ
اپنے ہاتھوں میں ہندوستاں کے علم کو اٹھائے ہوئے
بڑھ رہا تھا

دشمنوں کی صفوں پر
چڑھ رہا تھا
غم کی ماری ہوئی ماؤں کی ہچکیاں
بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کی سسکیاں
نعروں، جیکاروں، للکاروں میں ڈھل گئی تھیں
ہر طرف سے صدا آرہی تھی
"عہد نَو تو کہاں ہے"
اور پھر شور اٹھا
"عہد نَو آگیا ہے"
میں جو پلٹا تو اک اور تصویر دیکھی
تیرے ماتھے پہ تنویر دیکھی
تیری گودی میں اک چاند تھا جس کے لب ہل رہے تھے

"عہد نو آگیا ہے
میں ہوں گوتم کے سینے کی آواز
میں ہوں تخیل انساں کی پرواز
میں ہوں ٹیپو کی تلوار
میں ہوں جھانسی کی رانی کے خوابوں کی تعبیر
میں شہیدوں کے ماتھے کی تنویر

میں بھگت سنگھ کی روح ہوں
میں نئے عہد کے سخت طوفان میں
کشتیٔ نوح ہوں
میں ہوں چٹگاؤں کے باغیوں کا ترانہ
میں محمد علی کا فسانہ
میں ہوں اقبال و ٹیگور کا زمزمہ
میں ہوں دہقان و مزدور کا ہمہمہ
میرے خوں میں ہے گنگ و جمن کی روانی
اور رگوں میں ہمالہ کی کڑیل جوانی
عہدِ نو آگیا ہے
عہدِ نو آگیا ہے
دور ہو اے شہنشاہیت کے جذام
جاگ ہندوستاں کے غلام
انتقام، انتقام، انتقام، انتقام"

یہ صدا سن کے افلاک پر بجلیاں کڑکڑانے لگیں
اور میں چونک اٹھا
رات تاریک تھی اور سلاخوں کے باہر
آسماں ابر آلود تھا

جیل کی اونچی دیواروں پر بجلیاں آتشیں راہواروں کو دوڑا رہی تھیں

اپنے کوڑوں کو کڑکا رہی تھیں

ابر آلود اندھیرے کے دل میں سنہرے عقابوں کے شہپر چمک اٹھتے تھے

بجلیوں کی کڑک اور چمک، بادلوں کی گرج

انقلاب اور بغاوت کی الھڑ حسینہ کے پازیب کی تیز جھنکار تھی

یہ اندھیرے اُجالے کی پیکار تھی

جس کے ادنیٰ سپاہی ہیں ہم

فرنگی

وقت باقی رہا ہے زیادہ نہ کم

اب جدا تم کو ہونا ہے با چشم نم

جاوید

دیکھو افق پہ اندھیرا مچلنے لگا

دن شفق کی سنہری پہاڑی سے ڈھلنے لگا

اب تلک شام کا چمپئی رنگ آنچل فضاؤں میں لہرا رہا تھا

آسماں پھول برسا رہا تھا

لیکن اب ایک سرخ پھولوں کی ہر پنکھڑی سرمئی ہو چلی ہے

روشنی تیرگی کے سیہ غار میں کھو چلی ہے
اور فرنگی کے چہرے پہ تاریکیاں اک بھیانک ہنسی ہنس
رہی ہیں
نظریں غیظ اور نفرت کے شعلوں سے دہکی ہوئی ہیں
اور رعونت سے اینٹھے ہوئے ہونٹ یہ کہہ رہے ہیں
”وقت باقی رہا ہے زیادہ نہ کم
اب جدا ہم کو ہونا ہے با چشم پرنم
میری مریم
میری مریم

مریم

(گھبرا کر)

ہر طرف ہے یہ کیسا اندھیرا؟

جاوید

اس کے پیچھے چھپا ہے سویرا
جا کے کہنا ہے یہ اہل وطن سے
روح خوش ہو کے نکلی ہے تن سے
ہاتھ میں جام ہندوستاں کا
لب پہ ہے نام ہندوستاں کا

مریم

جو ہے مرنے پہ باندھے کمر ہے

مانگ سارا ترا ہم سفر ہے

جاوید

اور کچھ اور نزدیک آجا
اک خلش سی ہے دل میں مٹا جا
دیکھ لوں آخری بار تجھ کو
کر لوں اک رخصتی پیار تجھ کو

(مریم کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے)

مریم

رخصت اے میرے جاوید رخصت
ڈوبنے والے خورشید رخصت

(جاتی ہے)

جاوید

رخصت اے مریم، اے "جانِ مریم"
رخصت اے آدم، اے نسلِ آدم

(اس کی آواز مریم کے قدموں کی آواز کا تعاقب کرتی ہے)

رخصت اے زندگی کی بہارو
رخصت اے جاودانی شرارو
رخصت اے آسمانی نظارو

رخصت اے چاند سورج ستارو
رخصت اے نیلگوں کوہسارو
رخصت اے نقرئی آبشارو
رخصت اے گنگناتی ہواؤ
رخصت اے مسکراتی فضاؤ
رخصت اے صبح اے شام رخصت
رخصت اے حسن گل فام رخصت
رخصت اے انقلابی جوانو
رخصت اے ہند کے باغبانو
جب سنے خاکے میں رنگ بھرنا
ہم شہیدوں کو بھی یاد کرنا

چھٹی تصویر

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے

اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

اقبالؔ

چھٹی تصویر

مریم کا نوحہ

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

تیری محبوب مریم بلاتی ہے تجھ کو
کیا کبھی اس کی بھی یاد آتی ہے تجھ کو؟
اب تو آنکھیں ترستی ہیں صورت کو تیری
ہو گئیں میری تو تیبوں راتیں اندھیری
زہر لگتی ہے اُجڑی ہوئی زندگانی
آہ رکتی نہیں آنسوؤں کی روانی

غم کی سِل ہوتی جاتی ہے کچھ اور بھاری
بڑھتی جاتی ہے کچھ اور بھی بیقراری
روٹھ کر جانے والے، مناتی ہوں تجھ کو
تیری مریم ہوں میں، میں بلاتی ہوں تجھ کو
ملک تیرا ہے مصروفِ پیکار اب بھی
خاک ہے سرخ بوندوں سے گلنار اب بھی
خوں بھرے پرچم انگڑائی لیتے ہیں آ جا
جنگ کے طبل آواز دیتے ہیں آ جا
کب تلک، کب تلک کوئی آخر پکارے
آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا میرے پیارے

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

میری آنکھوں میں پہلی سی اب بھی چمک ہے
میرے ہونٹوں کے پھولوں میں اب بھی مہک ہے
میں تری آرزوؤں کا گلشن ہوں اب بھی
تیرے رنگین خوابوں کا مسکن ہوں اب بھی
میرے سینے میں ہے زندگی کا شرارہ

میرے پہلو میں ہے حریت کا ستارہ
باندھ کر اپنے ماتھے پہ سونے کا سہرا
یاد ہے تو نے اُلٹا تھا گھونگھٹ کسی کا
بیاہ کی میرے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی
صندلی مانگ تھی اس میں افشاں چنی تھی
اور اب مہندی ہاتھوں میں رچتی نہیں ہے
کوئی چوڑی کلائی میں بجتی نہیں ہے
ہائے کس نے وہ مہندی کی رنگت اُڑا لی
کس نے یہ میرے ماتھے سے افشاں چھڑا لی

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

یاد ہو گا تجھے وہ مرا لال جوڑا
تو نے کیا اپنا وہ عہد و پیمان بھی توڑا؟
میرے سنسان دل میں ہے کیسا اندھیرا
کیا کبھی میری دنیا میں ہو گا سویرا؟
تو نہیں ہے تو بھاتا نہیں کچھ بھی مجھ کو
کیا کہوں کس طرح یاد کرتی ہوں تجھ کو

ہار اشکوں کے بیٹھی ہوئی گوندھتی ہوں
میں تجھے رات بھر تاروں میں ڈھونڈتی ہوں
ہوک اٹھتی ہے چڑیوں کی آواز سن کر
پھینک دیتی ہوں رنگیں دوپٹے کو چن کر

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

ہنستی اور کھیلتی چاندنی رات آئی
گرمیوں بعد بھرپور برسات آئی
چھائیں ساون کی وہ کالی کالی گھٹائیں
اور پھر جیت پھاگن کی سنکیں ہوائیں
آم کے سبز باغوں میں پھر بور آیا
کوئلوں نے محبت بھرا گیت گایا
سب ہی آئے مگر ایک تو ہی نہ آیا
اپنے گھر اپنی مریم کو تو نے بھلایا
یوں تو دنیا کی ہر چیز ہے آنی جانی
ہو گئیں کل کی باتیں پرانی کہانی
اس طرح اپنی نظریں پھرانا ہے کوئی

کیا محبت کو بھی بھول جاتا ہے کوئی؟
شام ہوتی ہے اور ڈوب جاتا ہے سورج
صبح ہوتے ہی پھر لوٹ آتا ہے سورج
میرا سورج مگر جا کے واپس نہ آیا
جانے کیوں میرے پیارے کو پردیس بھایا

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

ندیاں دوڑ کر ملتی ہیں ساگروں میں
بھر کے رس لڑکیاں لاتی ہیں گاگروں میں
رات کی گود میں سوتے ہیں چاند تارے
چومتے ہیں زمیں کو فلک کے کنارے
باغ میں دور سے اُڑ کے آتے ہیں بھونرے
پھول کو گیت اپنا سناتے ہیں بھونرے
ساری دنیا پہ چھائی ہوئی ہے محبت
بے محبت کے ممکن نہیں ہے مسرت

(ایک عورت کے ہنسنے کی آواز)

ہنس رہی ہے کہیں کوئی میری سہیلی

اور میں گھر میں بیٹھی ہوئی ہوں اکیلی
دیکھتی ہوں میں جب اپنی ہم جولیوں کو
ہیبت کے پھولوں سے بھرتی ہیں جھولیوں کو
ان کی آنکھوں کے تارے چمکتے ہیں کیسے
ان کے دوشیزہ آنچل مہکتے ہیں کیسے
مسکراتے ہیں رہ رہ کے ان کے گریباں
ان کی سانسوں میں کھلتی ہیں رنگین کلیاں
جگمگاتا ہے چاند ان کی پیشانیوں پر
ان کے سینے ہنسی اور خوشی کے سمندر
میرے دل سے نکلتی ہیں کتنی دعائیں
ان کو اپنی بہاروں کے دن راس آئیں
نا چتی آرزو پر نہ بکھر جائے پانی
ہو نہ غمگین و افسردہ ان کی جوانی
اور بھی ان کی شاداب کھیتی ہری ہو
مانگ صندل سے بچوں سے گودی بھری ہو

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

وہ مسرت کے بیتے دنوں کی کہانی
میرے حسن و محبت تری نوجوانی
ان کو میں واپس آتے ہوئے دیکھتی ہوں
زیرِ لب مسکراتے ہوئے دیکھتی ہوں
رنگ ہی رنگ بس تیرتے ہیں فضا میں
سیکڑوں تتلیاں اڑ رہی ہیں ہوا میں
گذری راتوں کے طوفان دل میں چھپائے
لمحے اڑتے ہیں ہاتھوں پہ شمعیں جلائے
دن بنے ہفتے، ہفتے بنے ہیں مہینے
وقت کے چلتے رہتے ہیں یوں ہی سفینے
اک نیا روپ بھر لیتی ہے زندگانی
بن کے ماں مسکراتی ہے الھڑ جوانی
خواب میں مجھ کو آواز دیتا ہے کوئی
کروٹیں میرے پہلو میں لیتا ہے کوئی
جیسے بجلی سی لہراتی ہو بادلوں میں
جیسے جھنکار ہو نقرئی چھاگلوں میں
یوں مچلتا ہے وہ جیسے سوتوں میں پانی
جیسے بیتاب رگ رگ میں ہو نوجوانی
سنسنی جسم میں، چیونٹیاں جیسے رینگیں

درد پیڑو میں رہ رہ کے لیتا ہے پینگیں
زندگی کا نیا پھول ہے کھلنے والا
ہے مرے صبر کا پھل مجھے ملنے والا
سوچتی ہوں کہ وہ تیری تصویر ہو گا
میرے بچپن کے خوابوں کی تعبیر ہو گا
اس کے چہرے پہ ہو گا محبت کا ہالہ
اس کے ماتھے پہ تیری جبیں کا اجالا
کھائے جاتی ہے اس وقت تو تیری دوری
ہائے رہ جائے گی یہ خوشی بھی ادھوری
کھول کر اپنی آنکھیں وہ دیکھے گا کس کو
ہائے وہ باپ کہہ کر پکارے گا کس کو
یہ نہیں کہتی ہوں مجھ سے ملنے کو آنا
اپنے بچے کو بس اک نظر دیکھ جانا
وہ مری آنکھ کا تارہ وہ میرا دلبر
باپ کے پیار کو رہ نہ جائے ترس کر

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

کب تلک، کب تلک کوئی آخر پکارے
آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا میرے پیارے
آ بھی جا میرے پیارے
میرے دل کے سہارے

(نامہ بر آتا ہے)

نامہ بر

کیا یہ جاوید و مریم کا گھر ہے؟

مریم

ہاں مگر یہ بتا کیا خبر ہے؟
تجھ کو اپنا کہوں یا پرایا؟
نامہ بر کس کا خط لے کے آیا؟
موت کا جام یا زندگی کا؟
غم کا پیغام ہے یا خوشی کا؟

نامہ بر

زندگی ہے غموں کی کہانی
موت کا راگ ہے جاودانی
موت کی چھاؤں دیوار و در پر
موت کے پاؤں ہیں بحر و بر پر

موت کا رنگ ہے آب و گِل میں
موت سوتی ہے پھولوں کے دل میں
موت سے کس کو ہے رستگاری
آج وہ کل ہماری ہے باری
لیکن ایسے بھی ہیں مرنے والے
اپنی ماؤں کی گودوں کے پالے
جو اندھیرے سے ڈرتے نہیں ہیں
چڑھ کے سولی پہ مرتے نہیں ہیں
وہ ہیں ہمت کے جرأت کے پیکر
چلتے ہیں موت کا سر کچل کر
موت کا دل دہلتا ہے ان سے
موت کا دم نکلتا ہے ان سے
زندگی قوم پر وارتے ہیں
موت پر قہقہے مارتے ہیں
تازہ ہے ان شہیدوں کا گلشن
نام ان کا ہمیشہ ہے روشن

مریم

تو تو آیا ہے لیکر سنائی
لُٹ گئی ہائے میری جوانی

نامہ بر

تیرا شوہر جہاں سے سدھارا
اب ہے وہ آسماں کا ستارا
خوش ہو وہ فخرِ ہندوستاں ہے
آج سے زندۂ جاوداں ہے

مریم

کیا کہا؟ زندۂ جاوداں ہے؟
سچ بتا میرا شوہر کہاں ہے؟
اس نے جام محبت پیا تھا
لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا
تیرے ہاتھ اس نے پیغام بھیجا؟
کیا کوئی خط مرے نام بھیجا؟

نامہ بر (خط دکھا کر)

آخری اس کا پیغام ہے یہ
پر کسی اور کے نام ہے یہ

مریم

اس کا کیا کوئی میرے سوا ہے؟
مجھ کو کیا جانے کیا ہو رہا ہے
میں نے دی اس کو اپنی جوانی

آرزو، دلکشی، شادمانی
اپنے ہونٹوں کی شادابیاں دیں
اپنے سینے کی بیتابیاں دیں
روح کو اس کی میں نے جگایا
اس کے سنسان دل کو بسایا
میں نے مہکا دیا اس کا گلشن
حسن سے بھر دیا اس کا دامن
عشق کی پیاس میں نے بجھا لی
شمع تاریک گھر میں جلا لی
اس کے جذبات کی ترجماں ہوں
اس کے ننھے سے بچے کی ماں ہوں

نامہ بر

اس کی الفت کا پیغام ہے یہ
تیرے بچے ہی کے نام ہے یہ

مریم

میرا بچہ؟ مگر وہ کہاں ہے؟
میرے پہلو میں اب تک نہاں ہے
کیسے وہ تیری باتیں سنے گا؟
کیسے جاوید کا خط پڑھے گا؟

نامہ بر

وہ جو پہلو میں اب تک نہاں ہے
عہد نو کا مبارک نشاں ہے
جوش و ہمت کا پیغام یہ خط
ہے نئی نسل کے نام یہ خط
وہ نئی نسل جو آ رہی ہے
وقت کا خون گرما رہی ہے
تیرے شوہر نے مرنے سے پہلے
خط لکھا تھا یہ اپنے لہو سے
وہ اندھیرے سے ڈرتا نہیں ہے
چڑھ کے سولی پہ مرتا نہیں ہے

مریم

خوش ہوں وہ فخر ہندوستاں ہے
آج سے زندۂ جاوداں ہے
زندۂ جاوداں ہے
زندگی جاوداں ہے
آرزو جاوداں ہے
حسن بھی جاوداں عشق بھی جاوداں ہے

میرا بچہ

میرا بچہ
وہ بھی تو زندۂ جاوداں ہے
میرا شوہر
میرا جاوید
فخرِ ہندوستاں ہے
آسمان و زمیں کو سنا دو
ساری دنیا کو جا کر بتا دو
اس نے مجھ کو بھلایا نہیں ہے
نقشِ الفت مٹایا نہیں ہے
عہدِ نو کو بلانے گیا ہے
چاند سورج کو لانے گیا ہے
آئے گا اور ضرور آئے گا وہ
صبحِ نو بن کے چھا جائے گا وہ
جب گریں گے غلامی کے ڈیرے
جب اُڑیں گے خوشی کے پھریرے
راگنی قہقہوں کی چھڑے گی
ایک آزاد دنیا بنے گی
مسکراتا ہوا آئے گا وہ
جگمگاتا ہوا آئے گا وہ

اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے
میرا جام محبت پیا ہے
آئے گا اور ضرور آئے گا وہ
صبح نو بن کے چھا جائے گا وہ

(مبہوت کھڑی رہتی ہے)

نامہ بر نامہ بر ——— میرا شوہر
کیا کہا اس نے پھانسی پہ چڑھ کر؟
کیا مجھے یاد اس نے کیا تھا؟
کیا مرا نام اس نے لیا تھا؟

نامہ بر

ہاں لیا اور لیا نام تیرا
مرتے مرتے پیا جام تیرا
چوم کر اس نے پھانسی کی رسی
آنے والی سحر کی خبر دی
رنگ سا اس کے چہرے پہ آیا
اور وہ زیر لب مسکرایا
اور پھر یوں گرج کر پکارا
موت سے کیا رکے گا یہ دھارا
بن کے سورج اٹھیں گے ستارے

پھول بن کر کھلیں گے شرارے
موت کے لاکھ طوفان آئیں
ظلم کے ابر کتنے ہی چھائیں
رات کتنی ہی تاریک ہو جائے
آسماں چاہے نظروں سے کھو جائے
پر اندھیرا پگھل کر رہے گا
صبح سورج نکل کر رہے گا
پھول کو کون کھلنے سے روکے؟
کون آتے زمانے کو ٹوکے؟
یہ حکومت یہ ظالم حکومت کے ظالم شکنجے
کیا یہ ہندوستاں کے غلاموں کے لاکھوں کروڑوں گلے
گھونٹ دیں گے؟
کیا یہ جیلیں، یہ جیلوں کے پاپی ستمگار بدکار جیلر
کیا یہ فوجیں، یہ توپیں، یہ بندوق، سنگین اور بم کے
گولے
کیا ہمالہ سے سیلون تک اور بنگال و آسام سے لے کے
کشمیر تک
سارے ہندوستاں کو تشدد کے جلتے، بھڑکتے، دہکتے،
کڑکتے، گرجتے ہوئے تند اور تیز دوزخ کی پگھلی

ہوئی آگ میں جھونک دیں گے ؟
کیا یہ بڑھتی ہوئی نسلِ انساں کو بھی روک دیں گے ؟
ہاں کہو ان سے سینے میں دل میں کچوکے لگائیں
اور زخموں سے انساں کے جسم اور روح میں لاکھ سوراخ
کر دیں
لیکن اب وہ گھڑی آگئی ہے کہ ہر زخم سے ہوں گی پیدا
ہزاروں زبانیں جو دریا کو وادی کو، کہسار کو، دشت
کو، در کو، میدان کو، ایک اک اینٹ ایک
ایک پتھر کو، ایک ایک ذرے کو پیغام دیں
گی ـــــ بغاوت
اور ان پھانسیوں اور جیلوں کے پیچھے دہکتے اُفق پر مچلتے
ہوئے سرخ خون کے سمندر سے موجوں کے بیتاب
سینے کو یوں چیر کر آسماں پر اُبھر آئے گا سرخ آزاد
دنیا کا آزاد سورج
جس طرح ماں کی گودی میں بچہ

مریم

جیسے جاوید مریم کا بچہ
موسم کے لاکھ طوفان آئیں
ظلم کے ابر کتنے ہی چھائیں

رات کتنی ہی تاریک ہو جائے
آسماں چاہے نظروں سے کھو جائے
پر اندھیرا نگھل کر رہے گا
میرا بچہ ــــــــ
کیا کہا میں نے ؟
میرا بچہ ؟
میرا شوہر ؟
میرا سورج نکل کر رہے گا
نامہ بر خط کو پڑھ کر سنا دے
سو رہی ہے یہ دنیا جگا دے
بیت جائیں پرانے زمانے
عہد نو کے بجیں شادیانے

نامہ بر (خط کو پڑھ کر سناتا ہے)

محبت کے ننھے شرارے سلام
اندھیرے کے روشن ستارے سلام
ابھی ماں کے پہلو میں مستور ہے
ابھی زندگی سے بہت دور ہے
اندھیرے میں گم ہیں تیرے فکر و ہوش
ابھی ہیں عدم میں ترے چشم و گوش

تری آنکھ محرومِ نظارہ ہے
ابھی بطنِ مادر ہی گہوارہ ہے
ابھی تک ہے ہستی تری بے نمود
فقط گردشِ خوں ہے تیرا وجود

ابھی بن رہے ہیں وہ نقش و نگار
کہ جن کا زمانے کو ہے انتظار

مبارک تجھے گردشِ ماہ و سال
ابھرنے ہی کو ہیں ترے خط و خال
کلی تیری ہستی کی کھِل جائے گی
مسرت تری ماں کو مل جائے گی
ترے نقش کو بخش دے گی ثبات
پلائے گی وہ تجھ کو آبِ حیات
ترے دل میں ہوگی تمنائے نور
تری سانس میں زندگی کا سرور
کریں گی ہوائیں تجھے آ کے پیار
تجھے لوریاں دیں گے لیل و نہار
تجھے دیکھ کر مسکرائے گا چاند

اشاروں سے تجھ کو بلائے گا چاند
ستاروں کو حیرت سے دیکھے گا تو
انھیں توڑ لینے کو لپکے گا تو

یہی سوچ کر مسکراتا ہوں میں
تجھے زندگی دے کے جاتا ہوں میں

ڈھلا دن مری عمر کا آئی شام
اجل لائی ہے زہر آلود جام
مجھے ڈر نہیں موت کی رات کا
جو غم ہے تو ہے صرف اس بات کا
وہ دنیا وراثت میں پائے گا تو
جسے دیکھ کر تلملائے گا تو
یہ ہے تیرے ماضی کی کل کائنات
حوادث کے طوفاں مصائب کی رات
عداوت کے نغمے، کدورت کے ساز
لہو کے سمندر ستم کے جہاز

مگر پھر بھی جنسِ گراں ہے حیات

رواں ہے دواں ہے جواں ہے حیات

نئی تیری صہبا، نئے ہیں سبو
مری شرم کے داغ دھوئے گا تو
بنانا چٹانوں کے سینے پہ راہ
مگر اپنے ماضی پہ رکھنا نگاہ
کہیں ہمتوں کا نفس رک نہ جائے
ترے حوصلوں کی جبیں جھک نہ جائے
جوانی کہ جذبات کی آگ ہے
تمناؤں کا آتشیں راگ ہے
بھلانا نہ اس آتشیں راگ کو
بجھانا نہ جذبات کی آگ کو
خود اپنے لہو سے جلانا اسے
ہوا و ہوس سے بچانا اسے
جبیں تیری اس سے دمکتی رہے
نظر تیری اس سے چمکتی رہے

اسی آگ میں تپ کے نکھرے گا تو
افق سے زمانے کے ابھرے گا تو

نہ کرنا کبھی چشمِ حسرت کو بند
نہ ٹوٹے کبھی جستجو کی کمند
بتاتا ہوں میں تجھ کو رازِ حیات
عمل ہے عمل کارسازِ حیات
عمل کے لئے ہے فضا سازگار
شکاری ہے انساں زمانہ شکار
جو طوفان آئیں تو ڈرنا نہیں
مصیبت میں بھی آہ بھرنا نہیں
کبھی جذبۂ شوق گھٹنے نہ پائے
نظر آسمانوں سے ہٹنے نہ پائے
گذرنا مصائب سے منہ موڑ کر
حوادث کی زنجیر کو توڑ کر
یہ مانا کہ تاریک ہوتی ہے رات
ستاروں کے موتی پروتی ہے رات
جہانِ کہن کا یہ دستور ہے
سیاہی کے آغوش میں نور ہے

اگر دل میں ہے آرزو کا سرور
تو ہے زندگی نغمہ و رنگ و نور

مسرت نہاں سنگ پاروں میں ہے
فضاؤں میں ہے شاخساروں میں ہے
ہوائیں بجاتی ہیں جس دم ستار
پہاڑوں پہ گاتے ہیں جب آبشار
ہرے ہو کے جب لہلہاتے ہیں کھیت
بھری دھوپ میں جب چمکتی ہے ریت
کرن پھوٹتی ہے جب افلاک سے
نکلتی ہیں جب کونپلیں خاک سے
اُفق سے اُبلتا ہے جب رنگ و نور
ہواؤں میں اُڑتے ہیں جس دم طیور
تو بجتا ہے دل میں خوشی کا رباب
مسرت پلاتی ہے آکر شراب

یہ دریا یہ وادی یہ صحرا یہ پھول
مسرت نے بھیجے ہیں اپنے رسول

کوئی شے نہیں ہے جہاں میں حقیر
لبوں کا تبسم نگاہوں کے تیر
یہ شبنم کے قطرے کہ خس و خار پر

یہ ڈھلتی ہوئی دھوپ دیوار پر

یہ شاخوں میں ہنستی ہوئی پتیاں

یہ پانی کے چشمے یہ پگ ڈنڈیاں

یہ مکڑی کے جالے یہ چاندی کے تار

یہ پیڑوں کی گردن میں پھولوں کے ہار

یہ آندھی سے طوفان سے کم نہیں

سمندر کے ہیجان سے کم نہیں

انھیں سب سے مل کر بنی ہے حیات

یہ سانچے ہیں جن میں ڈھلی ہے حیات

نہ ہو زندگی سے کبھی دل فگار

عمل سے بنا لے اسے سازگار

شکاری ہے انساں زمانہ شکار

یہ آدمی کی گذرگاہ ـــــ شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
جبیں پہ کاتبِ تاریخ کی جلی تحریر
گلے سے سیکڑوں نقش قدم لگائے ہوئے
گذرتے وقت کے گرد و غبار کے نیچے
حسین جسم کی تابندگی چھپائے ہوئے
گذشتہ دور کی تہذیب کے منازل کو
جواں ماں کی طرح گود میں سلائے ہوئے

یہ آدمی کی گذرگاہ ـــــ شاہراہِ حیات

ہزاروں سال کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے
اِدھر سے گذرے ہیں چنگیز و نادر و تیمور
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے
غلاموں اور کنیزوں کے کارواں آئے
خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے نہائے ہوئے
شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اُٹھائے ہوئے
جلالِ شیخ و شکوہِ برہمنی کے جلوس
ہوس کے سینوں میں آتشکدے چھپائے ہوئے
جہالتوں کی طویل اور عریض پرچھائیں
توہمات کی تاریکیاں جگائے ہوئے
سفید قوم کے عیار تاجروں کے گروہ
فریب و مکر سے اپنی دُکاں سجائے ہوئے
شکست خوردہ سیاسی گداگروں کے ہجوم
ادب سے، ٹوٹی ہوئی گردنیں جھکائے ہوئے
غموں سے چور مسافر، تھکے ہوئے راہی
چراغ روح کے، دل کے کنول بجھائے ہوئے

ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغِ وقت کی رنگین لَو بڑھائے ہوئے
بغاوتوں کی سپہ انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں فلک پر نظر جمائے ہوئے
غرورِ فتح کے پرچم ہوا میں لہراتے
ثبات و عزم کے اونچے علم اٹھائے ہوئے
ہتھیلیوں پہ لئے آفتاب اور مہتاب
بغل میں کرۂ ارضِ حسیں دبائے ہوئے
اٹھو اور اٹھ کے انھیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن
مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

---

۲۸ دسمبر ۱۹۴۶ء

جمہور

ایک سیاسی مثنوی

طبع اول — مارچ ۱۹۴۶ء
طبع دوم — فروری ۱۹۴۷ء

پیش لفظ

اردو میں سیاسی مثنوی کا رواج نہیں ہے۔ "جمہور" اس قسم کی پہلی چیز ہے۔

پرانی مثنویوں میں عام طور سے دیو پریوں کے قصے اور شہزادوں کے عشق کی داستانیں ہوتی تھیں۔ عام انسان تو کیا اس کی پرچھائیں بھی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ شوق قدوائی ان روایتی ملبندیوں سے صرف اتنے نیچے اتر سکے کہ پری کی جگہ سوداگر کی بیٹی اور شہزادے کی جگہ لکھنؤ کے نواب صاحب نے لے لی۔ اقبال نے پہلی بار مثنوی کو اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا لیکن انھوں نے انسپریشن ایرانی شعرا اور خصوصیت کے ساتھ مولانا روم کی مثنوی سے حاصل کیا تھا حالانکہ اقبال کی مثنویوں میں بھی عام انسان کا کردار نہیں ابھرتا (صرف "جاوید نامہ" کے آخری حصے میں عوام کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ " دیدہ ام صدق وصفا را در عوام ") پھر بھی انھوں نے آنے والے شعرا کے لئے نئی راہ کھولدی۔

حیرت ہے کہ اس مفید صنف سے ترقی پسند شعرا نے اب تک کوئی کام نہیں لیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے کیفی کے سوا کسی دوسرے شاعر نے

مثنوی کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ شاید انھوں نے مثنوی کو پرانی چیز سمجھ کر ترک کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس صنف میں بہت امکانات ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہم اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جب میں ہندستان اور دنیا کے موجودہ حالات، قومی اور بین الاقوامی جدوجہد اور کش مکش اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی جذبات و احساسات کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ مثنوی کے سوا اور کوئی صنفِ شعر انہیں اپنے دامن میں نہیں سمیٹ سکتی۔ فردوسی کے "شاہنامہ" سے اقبال کے "ساقی نامہ" تک فارسی اور اردو مثنوی کا ورثہ ہمارا بہت بڑا سرمایہ، بہت بڑی دولت ہے۔ پھر یہ کفرانِ نعمت کیوں؟

ابھی تک عصرِ حاضر کا شاندار رزمیہ نہیں لکھا گیا ہے جس کا تار و پود وقت نے تیار کر دیا ہے۔ "جمہور" ایک حقیر سی کوشش ہے۔ اس کے ہیرو عوام ہیں۔ محنت کش اور باعمل عوام جن کے ہاتھوں میں زندگی کی باگیں ہیں۔ وہ سطحِ زمین پر کیڑوں کی طرح نہیں رہے ہیں بلکہ کرۂ ارض کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے رجعت پرستوں کا نعرہ یہ ہے کہ عوام آرٹ اور شعر کا موضوع نہیں ہو سکتے۔

عوام سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ ان کے خواب سب سے سہانے خواب ہیں ان کا نصب العین سب سے بلند نصب العین ہے۔ وہ سماج اور تاریخ کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ زندگی انھیں سے حرارت حاصل کرتی ہے اور انھیں سے رنگ۔ شعر و ادب انھیں سے حسن اور قوت حاصل کر سکیں گے۔

اس درخت کی پتیاں توڑی جاسکتی ہیں۔ شاخیں کاٹی جاسکتی ہیں لیکن اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ انھیں اس وقت تک نہیں اکھاڑا جاسکتا جب تک کرۂ ارض کو پاش پاش نہ کر دیا جائے۔ اس لئے کٹی ہوئی شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں گی، نئی پتیاں نکلتی رہیں گی، نئے پھول کھلتے رہیں گے۔

سردار جعفری زندہ باد

بمبئی۔ دسمبر ۱۹۴۶ء

حرفِ اوّل

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو
اٹھو انقلابی جوانو اٹھو

کسانو اٹھو کامگارو* اٹھو
نئی زندگی کے شرارو اٹھو

اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے
اٹھو خاکِ بنگال و کشمیر سے

اٹھو وادی و دشت و کہسار سے
اٹھو سندھ و پنجاب و ملبار سے

اٹھو مالوے اور میوات سے
مہاراشٹر اور گجرات سے

اودھ کے چمن سے چہکتے اٹھو
گلوں کی طرح سے مہکتے اٹھو

اٹھو کھل گیا پرچمِ انقلاب
نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب

اٹھو جیسے دریا میں اٹھتی ہے موج
اٹھو جیسے آندھی کی بڑھتی ہے فوج

اٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے
کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے

غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

---

* کامگار۔ مزدور

جمہور

یہ ہندوستاں رشکِ خلدِ بریں
اُگلتی ہے سونا وطن کی زمیں

کہیں کوئلے اور لوہے کی کان
کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹان

کہیں سنگِ مرمر کی شفاف سِل
پھسلتا ہے جس کی صفائی پہ دل

بہت سے خزینے ہیں اس خاک میں
ہزاروں دفینے ہیں اس خاک میں

ہماری گھٹائیں گہربار ہیں
ہمارے بیاباں بھی گلزار ہیں

بڑے رس بھرے ہیں ہمارے ثمر
بہت ہی گھنے ہیں ہمارے شجر

گل و لالہ و یاسمن کے ایاغ
مہکتے ہوئے آم کے سبز باغ

لٹکتے ہوئے خوشے انگور کے
چھلکتے ہوئے جام بلور کے

ہرے اور بھرے جنگلوں کی بہار جھلا جھل چمکتے ہوئے ریگ زار
یہ سورج کی رنگین کرنوں کا جال کہ جس طرح فطرت نے کھولے ہوں بال
اُفق سے اُبلتا ہوا رنگ و نور فضاؤں میں پرواز کرتے طیور
کہستان کے یہ سنہرے عقاب ہواؤں میں اڑتے ہوئے آفتاب
کنول جھیل میں مسکراتے ہوئے چراغاں کا منظر دکھاتے ہوئے
یہ پھولوں سے گل پیرہن شاخسار غزالوں سے معمور یہ مرغزار
تڑپتی مچلتی ہوئی بجلیاں سمندر میں ملتی ہوئی ندیاں
یہ نیلم اور الماس کے کوہسار یہ چاندی کے پگھلے ہوئے آبشار
یہ مخمل میں لپٹی ہوئی وادیاں ہمالہ کی گل پوش شہزادیاں
یہ گنگا کا آنچل، یہ جمنا کی ریت یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت

مگر یہ خزانے ہمارے نہیں
ہمارے نہیں ہیں تمہارے نہیں

یہاں سے جو اٹھتی ہے لیکر گھٹا گھٹا وہ برستی ہے انگلینڈ پر
ہمارے مقدر میں افلاس ہے غلامی کی ہر جسم میں باس ہے
ہماری زمیں جتنی زرخیز ہے وبا قحط کی اتنی ہی تیز ہے

جسے دیکھو مفلس ہے کنگال ہے ہر اک شہر ہر گاؤں بنگال ہے
کوئی سسکیاں بھر رہا ہے یہاں کوئی ہچکیاں لے رہا ہے وہاں
کہیں ماؤں بہنوں کا ہی مول تول کہیں بے حیائی کے بجتے ہیں ڈھول
نہ کھانے کو روٹی نہ کرنے کو کام اندھیری ہیں صبحیں الم ناک شام
نہ ہو عمر کیوں جھونپڑوں میں بسر کہ ہے بھیک پر اب ہماری گذر

ہمیں حکم ہے اس طرح سے جئیں
کہ گنگا کے ساحل پہ پیاسے مریں

ہے ٹوٹا ہوا سازِ بزمِ وطن ہے صدیوں سے افسردہ یہ انجمن
نہ رادھا نہ رادھا کے نوخیز گیت کشن کی نہ وہ بانسری اور نہ پیت
نہ وہ رام کی تمکنت اور وقار نہ لچھمن کی الفت نہ سیتا کا پیار
نہ گوتم کے سینے کا صدق و صفا نہ ساوتری کا خلوصِ وفا
نہ برنائیاں اور نہ رعنائیاں نہ وہ ہیر رانجھا کی انگڑائیاں
نہ نانک کی گفتار کی نرمیاں نہ ٹیپو کی پیکار کی گرمیاں
بھگت سنگھ کے خون کا وہ ابال نہ چٹگاؤں کے باغیوں کا جلال
محمد علی کے نہ وہ ہم ہمے نہ اقبال و ٹیگور کے زمزمے

نہ عصمت نہ عفت نہ عزت نہ شان　　نہ غیرت نہ ہمت نہ وہ آن بان

جو جوہر تھے اخلاق و کردار میں　　وہ بکتے ہیں اب چور بازار میں

کدورت ہے سینوں میں اور افتراق　　نگاہوں میں نفرت دلوں میں نفاق

چلاتا ہے خود بھائی بھائی پہ تیر　　غلامی نے بدلا ہمارا ضمیر

بس آپس میں دست و گریباں ہیں ہم
خود اپنے ہی ہاتھوں پریشاں ہیں ہم

مگر پھوٹ کی شاخ پھلتی نہیں　　دعاؤں سے قسمت بدلتی نہیں

سیاست کے ہارے جواری ہیں ہم　　حکومت کے در کے بھکاری ہیں ہم

بچھاتے ہیں جو بادشاہی کا دام　　بناتے ہیں جو آدمی کو غلام

جو چنگیز سے بڑھ کے سفاک ہیں　　جو دجال کی طرح ناپاک ہیں

جو بدکیش و بدذات و بدکار ہیں　　ہم ان سے کرم کے طلب گار ہیں

وہ قاتل فلسطین و یونان کے　　وہ دشمن ہیں جاوا کے ایران کے

وہ سینے پہ ہیں ایشیا کے سوار　　وہ انسان کا کھیلتے ہیں شکار

انھیں ہے شہنشاہیت کا جنون　　وہ بچوں کا بھی چوس لیتے ہیں خون

اٹھا ہے گناہوں سے ان کا خمیر　　بنا ہے سیاہی سے ان کا ضمیر

فسوں انکا بربط جنوں انکا راگ — دہکتی ہے ان کے کلیجے میں آگ
نہ بوئے وفا ان میں ہے اور نہ مہر — رگوں میں ہے ان کی حکومت کا زہر
وہ مظلوم پر رحم کھاتے نہیں — کبھی بھیڑیئے مسکراتے نہیں
ٹپکتا ہے جبڑوں سے جن کے لہو — بدلتی نہیں ہے کبھی ان کی خو
نہ جانے ہمیں آئے گا کب یقین — کہ شعلوں سے شبنم ٹپکتی نہیں

اُتارا نہیں توڑا جاتا ہے تاج
کہ مرتا نہیں خود بخود سامراج

ہماری نگاہیں لگی ہیں جہاں — نئی سازشیں ہو رہی ہیں وہاں
وہ بس وار کرنے کو تیار ہیں — کہ غافل یہاں ہم اور وہ ہشیار ہیں
غلامی نئے بھیس میں آئے گی — وہ اک اور سانچے میں ڈھل جائیگی
نیا جال لائے گا صیاد ابھی — کرے گا ہمیں اور برباد ابھی
حکومت کی اک اور تجویز ہے — مداری کی جھولی میں ہر چیز ہے
وطن ٹکڑے ٹکڑے کیا جائے گا — یہاں یونین جیک لہرائے گا
دکھائی نہ دے گا ہلالی نشاں — ترنگے کی اُڑ جائیں گی دھجیاں

نحوست یہاں رقص فرمائے گی
غلامی کی زنجیر کس جائے گی

مگر غم نہ کر اے زمینِ وطن | اندھیرے کے سینے سے پھوٹی کرن
اب اٹھتے ہیں ہندوستاں کے سپوت | لرزتا ہے جن سے حکومت کا بھوت
کسان اور مزدور گاتے ہوئے | اٹھے اپنا پرچم اڑاتے ہوئے
یہ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی | یہ دریا بھی ہیں اور طغیان بھی
ہر اک ان میں کمزور و نادار ہے | مگر اتحاد ان کی تلوار ہے
بڑی سخت راہوں سے گذرے ہیں یہ | بڑے جوش کے ساتھ ابھرے ہیں یہ
وطن کے شہیدوں کی روحیں ہیں ساتھ | سروں پر ہے جھانسی کی رانی کا ہاتھ
انھوں نے کیا کوہساروں کو پست | حکومت نے مانی ہے ان سے شکست
یہ لڑتے ہیں آندھی سے طوفان سے | یہ ہٹتے نہیں اپنے میدان سے
یہ سولی سے پھانسی سے ڈرتے نہیں | یہ سو بار مر کر بھی مرتے نہیں
یہ جی چھوڑنا جانتے ہی نہیں | یہ منہ موڑنا جانتے ہی نہیں
یہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں کام | بدلتے ہیں آکر پرانا نظام
یہ ذوقِ عمل کے پرستار ہیں | یہی عصرِ حاضر کے معمار ہیں

انھیں اپنی محنت پہ ہے اعتماد — انھیں اپنی قوت پہ ہے اعتماد
محبت سے دل ان کا معمور ہے — نیا ان کی محفل کا دستور ہے
نیا ان کا ساقی نئے ان کے جام — نئی ان کی مجلس نیا اہتمام

یہ انساں کی وحدت کے پیغام بر
نئے دور کی دے رہے ہیں خبر

جمہور کا اعلان نامہ

"زمانے کے انداز بدلے گئے — نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے — گراں خواب چینی سنبھلنے لگے"

اٹھا خاکِ جاوا سے طوفانِ نور — بغاوت نے پھونکا قیامت کا صور
بھڑکتی ہیں ایران میں چنگاریاں — یہ ہیں صبحِ عشرت کی تیاریاں
اجالا ہے مشرق کے ایوان میں — سحر ہو گئی شام و لبنان میں

بڑھی لے کے جمہوریت اپنی فوج
ملی نیل سے جا کے دجلے کی موج

جل اُٹھے غلاموں کے سینے کے داغ
بکنگھم میں گُل ہو رہے ہیں چراغ

گرے قصرِ شاہی، ہلے تخت و تاج
نئی کروٹیں لے رہا ہے سماج

ملے زندگی کو نئے بال و پر
نئی منزلیں ہیں نیا ہے سفر

نئے میکدے مسکرانے لگے
نئے جام گردش میں آنے لگے

نئی صبح ہے اور نیا آفتاب
مبارک زمانے کو یہ انقلاب

ہمیں صبح نو ہیں ہمیں آفتاب
ہمیں ہیں بغاوت ہمیں انقلاب

اندھیری شبوں کے ستارے ہیں ہم
جو بجھتے نہیں وہ شرارے ہیں ہم

پہاڑوں کو ہٹتے ہیں ہم ریل کر
نکلتے ہیں طوفان سے کھیل کر

امیروں نے ہم کو ستایا بہت
حکومت نے ہم کو دبایا بہت

ہمارے لئے قید خانے بنے
ہمارے لئے تازیانے بنے

ہمیں پتھروں پر سلایا گیا
ہمیں سولیوں پر چڑھایا گیا

مگر ہم یہ سب ظلم سہتے رہے
مصائب کے دریا میں بہتے رہے

طمانچے حوادث کے کھاتے رہے
مگر اپنا پرچم اُڑاتے رہے

غریبی کے ہاتھوں پریشاں رہے — ہواؤں کی زد پر فروزاں رہے
تڑپتے، مچلتے، اُچھلتے رہے — چٹانوں کے دل سے اُبلتے رہے
شعاعوں کی صورت بکھرتے رہے — بکھرتے، نکھرتے، سنورتے رہے
اُبھرتے رہے مٹ کے ہم بار بار — بڑھاتے رہے زندگی کا وقار

کبھی بزدلی ہم پہ چھائی نہیں
ہمیں موت کی نیند آئی نہیں

مگر جو بنانے تھے ہم کو غلام — جو جیتے تھے پی کر لہو صبح و شام
بڑا ناز تھا جن کو تلوار پر — جو سوتے تھے لاشوں کے انبار پر
جو کرتے تھے دنیا کو زیر و زبر — وہ جن کی کنیزیں تھیں فتح و ظفر
اُنھیں کھا گئے آسمان و زمیں — نشاں ان کی قبروں کے ملتے نہیں
کہاں ہیں وہ فرعون و ہامان اب — کہاں ہیں وہ خونخوار سلطان اب
وہ شاہانِ نسلِ کیانی کہاں — وہ جبر و تشدد کے بانی کہاں
وہ نادر کہاں ہے سکندر کہاں — کہاں ہے مسولینی ہٹلر کہاں
وہ چین اور تاتار کے کج کلاہ — جو بیٹھے تھے بن بن کے عالم پناہ
درندے جو دشمن تھے انسان کے — جو چھوڑے تھے طاعون وسرطان کے

وہ سب موت کی گود میں سو گئے
وہ سب وقت کی گرد میں کھو گئے

نہ چنگیز ہے اور نہ تیمور ہے
جو باقی ہے کوئی تو جمہور ہے

زمانے کے دریا کی موجِ جواں
ازل سے ابد تک رواں اور دواں

ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم
کہ فانی نہیں جاودانی ہیں ہم

ہمیں سے ہیں تہذیب کے نقش و رنگ
ہمیں سے تمدن کے دل کی امنگ

ہمارے ہی دم سے نشانِ حیات
ہمیں دیں گے انسانیت کو نجات

مسیحا کے ہونٹوں کا اعجاز ہم
محمدؐ کے سینے کی آواز ہم

ہماری جبیں پر ہے محنت کا تاج
ہمیں نے لیا ہے زمیں سے خراج

ہماری ہی قوت سے چلتے ہیں مل
دھڑکتے ہیں ہم سے مشینوں کے دل

ہواؤں میں پرواز کرتے ہیں ہم
طرارے سمندر میں بھرتے ہیں ہم

کیا ہم نے فطرت کو زیرِ نگیں
جھکا دی زمیں پر فلک کی جبیں

کیا زندگی کے اندھیرے کو دور
نچوڑا ہے سورج کی کرنوں سے نور

ہمیشہ سے ہم گرم پیکار ہیں
نوارتیغ کی تیز تلوار ہیں

فرانسیس کے سر پہ کڑکے تھے ہم — شکاگو کے پہلو میں بھڑکے تھے ہم

دیا ہے نئے عہد کو ہم نے خون — بنایا تھا پیرس میں ہم نے کمیون

جو لینن کے سینے میں طوفان تھا — ہمارے سمندر کا ہیجان تھا

وہ انساں کی جنت وہ سرخ انجمن — ہماری جبیں کی ہے پہلی کرن

جو یورپ کی راتوں میں ہیں ضو فشاں — ہماری نگاہوں کی ہیں بجلیاں

دلِ ایشیا میں ہے جو اضطراب — ہماری ہی ہے روح کا پیچ و تاب

یہ صدیوں کے انسان کا سوز ہے

یہ جمہور کا جشنِ نوروز ہے

ہماری نگاہوں میں پیغامِ عید — ہمیں سے ہے ہندوستاں کی امید

ہمیں ڈھال ہیں ہم ہی تلوار ہیں — ہمیں فوج ہیں ہم ہی ہتھیار ہیں

زمیندار ہوں یا کہ سرمایہ دار — ولایت کے حاکم ہوں یا شہریار

وجود ان کا ہندوستاں پہ ہے بار — کہ جس طرح سورج کے رُخ پر غبار

یہ ہیں فخر حیوانیت کے لئے — یہ ہیں کوڑھ انسانیت کے لئے

بلندی سے نیچے گرا دو انھیں — یہ پیغام جا کر سنا دو انھیں

حیات آپ سے آج بیزار ہے

حضور آپ کی قبر تیار ہے

چمن اس کا ہے جو چمن میں رہے — وطن اس کا ہے جو وطن میں رہے
ہر اک قوم آزاد و آباد ہو — ہر اک اپنے گھر رہ کے دلشاد ہو
ہر اک اپنے خطے میں پھولے پھلے — ستاروں سے ہم دوش ہو کر چلے
مٹے اس طرح عمر بھر کا فساد — وطن میں ہو قائم نیا اتحاد

دھنک میں کئی طرح کے رنگ ہوں
مگر پھر بھی وہ سب ہم آہنگ ہوں

یہ دولت ہے میراث انسان کی — زمیں پر حکومت ہے دہقان کی
ملوں پر ہے مزدور کا اختیار — وطن پر ہے جمہور کا اختیار
جو موتی نکالے وہ دامن بھرے — جو محنت کرے وہ حکومت کرے

ہماری کسوٹی ہے انسانیت
اخوت، مساوات، اور حریت

محبت کے جذبے ابھاریں گے ہم — پریشان زلفیں سنواریں گے ہم
عناصر کے گھوڑوں پہ ہو کر سوار — کریں گے غریبی کے سینے پہ وار
سمندر سے موتی نکل آئیں گے — زمیں کے خزانے ابل آئیں گے

گھٹاؤں میں تبدیل ہوگا دھواں — برسنے لگیں گے ستارے یہاں
نہ پھر خوف ہوگا نہ پھر احتیاج — نئے سر سے تعمیر ہوگا سماج
یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی — کسانوں کی دنیا بدل جائے گی
رہے گا نہ کوئی بھی بے روزگار — مصیبت سے چھٹ جائیں گے کامگار
نہ ہوگا مشینوں کا انساں غلام — مشینوں پہ قبضہ کریں گے عوام
سجا دیں گے چیزوں سے بازار ہم — لگا دیں گے دولت کے انبار ہم
پنھائیں گے بچوں کو رخت حریر — ہمالہ سے لائیں گے ہم جوئے شیر
سنہرے دوپٹے اڑھائیں گے ہم — ستاروں سے آنچل بنائیں گے ہم
پھلے اور پھولے گا بھارت کا باغ — جلیں گے ہر اک گھر میں گھی کے چراغ
کریں گے یہاں رقص حسن و شباب — زمیں پر اتر آئے گا آفتاب
وہ شاداب چہروں پہ ہوگا نکھار — کہ جھینپیں اجنتا کے نقش و نگار

نئی دیں گے ہاتھوں کو تنویر ہم
بدل دیں گے انساں کی تقدیر ہم

۱۱ر دسمبر ۱۹۴۶ء